ادیبۂ بھوپال

محترمہ مس رضیہ فرحت کے لکھے ہوئے

درد، سوز، محبت میں ڈوبے ہوئے

اور زندگی کی اُلجھنوں کو سُلجھانے والے

پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ

اُلجھے تار

پبلیشر

مینیجر ریجنٹ نیوز ایجنسی۔ دہلی

دوسرا ایڈیشن

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

رضیہ کے افسانے

کئی برسوں سے رسالہ خاتونِ مشرق میں مس رضیہ فرحت کے افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ مشرقی بہنیں رضیہ کے افسانے خوب پسند کرتی ہیں۔ اس کتاب میں جس قدر افسانے چھاپے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی افسانہ شاید "خاتونِ مشرق" میں نہیں چھپا۔ رضیہ کو اپنے افسانوں میں زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کا طریقہ بہت اچھا آتا ہے۔ اس مناسبت سے اس کتاب کا نام "الجھے تار" رکھا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ رضیہ کے افسانوں کی یہ کتاب پسند کی جائے گی۔ اُن کے اور جس قدر افسانے خاتونِ مشرق میں چھپ چکے ہیں۔ اُن کو کتابی شکل میں چھاپنے کی کوشش کروں گا۔

کئی مہینے سے اس کتاب کو چھاپنے کا ارادہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن کاغذ اور کتابت کی مشکلات کے ساتھ ساتھ شائع کرنے کے لئے مجھکو مہلت بھی حاصل نہیں تھی۔

مسٹر انور نے میرے کہنے سے الجھے تار کو اپنے کتب خانہ

ہماری جنت نیوز ایجنسی دہلی سے

شائع کر دیا ہے۔ اس لئے مجھکو مسٹر انور کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

عبداللہ فاروقی
نگران رسالہ خاتونِ مشرق دہلی
۲۸ راپریل ۱۹۴۷ء

نذر

مقدّس ترین پدر بزرگوار

خان بہادر عالی جناب سید الطاف احمد صاحب علوی
ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس حکومت بھوپال کے نام!
جن کی گودوں میں میں نے پرورش پائی

اور

جن کی توجہ اور عنایت سے میں نے افسانہ نویسی اور مضامین نگاری کے لئے اپنا شوق جاری رکھا۔

نیک باپ کی بیٹی
عاجزہ **رضیہ فرحت**

بھوپال
۲۹ر اپریل ۱۹۴۷ء

فہرست

بربط

صبح کا وقت تھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ناول پڑھ رہا تھا۔ ناول میں دل نہ لگا۔ نیچے اترنے لگا کہ بربط نظر آئی۔ کتابیں لئے اسکول جا رہی تھی۔ میں نے دیکھ کر چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

تمہارے محبت کے نغمے صدا میں
بربط کے تاروں پہ گاتا رہوں گا
جہاں ہنس کے تو نے بکھیری تھیں کلیاں
وہاں غم کے آنسو بہاتا رہوں گا

وہ مجھے دیکھکر مسکرائی اور چل دی۔ بربط ہمارے گھر کے سامنے رہتی تھی وہ انجینیر صاحب کی لڑکی تھی۔ بربط ایک حسین لڑکی تھی۔ گورا چٹا رنگ۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، گھونگریالے بال۔ غرض وہ بہت حسین تھی۔ ایک ہماری بہنیں ہیں سب کی سب بدشکل ہیں۔ کوئی موٹی ہے تو کوئی کالی ہے۔ میں یہی سب سوچتا ہوا نیچے آیا آ کر کیا دیکھتا ہوں نغمہ صاحبہ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ میں پاس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیوں ری نغمہ اسکول نہیں جائے گی۔"

ابھی تو نو ہی بجے ہیں وہ کڑک کر بولی۔

نو بجے ہیں تو کیا ہوا۔ بربط تو جا رہی تھی اسکول۔ میں نے کتاب چھینتے ہوئے کہا۔ تو وہ تنک کر بولی۔ تو جناب اوپر بیٹھے بربط ہی کو تکا کرتے ہیں۔

جا کر تیار ہو۔ میں نے کتاب پھینک کر کہا۔

وہ میرا ہاتھ جھٹک کر بولی - اور میں تجھ سے بڑی ہوں۔
تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ کو باجی کہیں۔
ہاں" وہ غرور سے بولی۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا
بڑی حسین ہیں جو باجی کہیں۔
تو کون بڑا پری زاد ہے۔ وہ طعنہ سے بولی۔
میں نے جوش سے کہا" آپ سے زیادہ حسین ہوں۔ آپ سے زیادہ گوری رنگت
ہے۔ اور اور ......
میں پھوپی سے جا کر کہتی ہوں۔ وہ جاتے ہوئے بولی۔ میں نے دوڑ کر اس کی ساڑھی
پکڑ لی۔ باریک ساڑھی تھی ایک جگہ سے پھٹ گئی۔
کیوں! ساڑھی کیوں پھاڑ دی۔ ایک گھونسہ میری پیٹھ پر پڑا۔
گھر میں اتنی اچھی اچھی ساڑھی کیوں پہنتی ہے میں کھسیانہ ہو گیا۔ وہ روتی ہوئی
چلی گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور آئینے کے سامنے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے لگا
اور ساتھ ہی ساتھ اپنی گوری رنگت دیکھ کر خوشی سے پھولنے لگا۔ میں ٹائی کی گرہ ہی
باندھ رہا تھا کہ پھوپی صاحبہ کا گھونسہ میری پیٹھ پر پڑا۔
اج کیا مجھ پر گھونسوں کی بارش ہوگی۔ میں نے پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔
یہ تیرے کرتوتوں کی سزا ہے" وہ ناز سے بولیں۔
دیکھو اگر آپ نے اب مارا، تو میں آپ کا داماد نہیں بنوں گا۔ میں آنکھیں
پھرا کر بولا۔
تجھے کون اپنا داماد بناتا ہے۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر بولیں۔
آپ ہی تو خوشامد کرتی ہیں۔ میں اکڑ کر بولا۔
کیا میری شاہدہ فالتو ہے جو تیرے پلے باندھ دوں گی

آپ کی لاڈلی سے خدا ہر ایک کو محفوظ رکھے" میں نے طعنے سے کہا۔

وہ غصے سے بولیں "نغمہ ابھی روتی ہوئی گئی ہے"۔

"تو میں کیا کروں" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تجھے شرم نہیں آتی۔ بڑی بہن پر ہاتھ اٹھاتے" وہ ذرا تیزی سے بولیں

"میں نے نغمہ کو کب مارا آپ کی شاہدہ نے چغلی کھائی ہوگی" میں نے میز پر کی کتابیں الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

"میری شاہدہ کیوں کہنے لگی"۔ اور پھوپی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ میں نے سوچا کہ نغمہ سے بدلہ لوں تو میرا نام انور نہیں۔ نغمہ مجھ سے چھ مہینے تو بڑی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے باجی کہو اور پھوپی فرماتی ہیں کہ مجھے داماد بنائیں گی جیسے میں ان کی شاہدہ پر مرتا ہوں اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ابا اپنے باپ کے صرف اکلوتے فرزند تھے اور دو بہنیں تھیں۔ ہماری بڑی پھوپی پیاری امرتسر ہی میں رہتی تھیں۔ اور کبھی کبھار ہمارے یہاں آجاتی تھیں۔ اور یہ چھوٹی پھوپی تو ہمارے ہی پاس رہتی ہیں۔ چھوٹے پھوپا کا تو..... انتقال ہو چکا ہے۔ ہمارے پھوپا بہت امیر تھے۔ ان کی تمام جائداد پھوپی نے اپنی اکلوتی شاہدہ کے نام کردی ہے اس لئے میرے والد چاہتے ہیں کہ میری شادی شاہدہ سے ہو جائے۔ اور تمام جائداد میرے قبضے میں آجائے اور پھوپی چاہتی ہیں کہ لڑکی گھر کی گھر ہی میں رہے لیکن مجھے شاہدہ ذرا پسند نہیں ہے کیونکہ وہ بہت بدمزاج ہے اور کمبخت ضرورت سے زیادہ موٹی بھی ہے۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے کیونکہ کالج کا وقت ہو گیا تھا۔ میں کپڑے تبدیل کرکے اندر آیا پھوپی صاحبہ کی لاڈلی تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ نجمہ نغمہ وغیرہ اسکول جا چکی تھیں ابا جان بھی اسپتال جا رہے تھے۔ ہمارے ابا میونسپل سرجن تھے میں نے شاہدہ سے کہا۔

"کیوں ری شاہدہ ہر وقت لیٹی رہتی ہے۔ کچھ کام نہیں کرتی جبھی تو اتنی موٹی ہو گئی

جارہی ہے۔ شاہدہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔ ارے ابھی ناشتہ بھی ملے گا یا نہیں۔ پہلے اپنی لاڈلیوں کو کھلا دیتی ہیں۔ چاہے کالج والے کالج بھوکے جائیں۔ میری آواز سُن کر امی دوڑی آئیں۔ ابھی لائی بیٹا! اور باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ میں بغیر ناشتہ کیئے ہوئے کالج چلا گیا۔ شام کو میرا کرکٹ میچ تھا۔ اس لئے چھ بجے گھر آیا۔ اور اوپر سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ ابھی کمرے کے اندر نہیں گیا تھا کہ مجھے کسی کے بات کرنے کی آواز آئی۔ شاہدہ اور برلبط باتیں کر رہی تھیں۔ شاہدہ کہہ رہی تھیں ہاں! وہ انور ایسا ہی ہے مجھے ہر وقت موٹے ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔ بھلا بتاؤ موٹا ہونا بھی کوئی گناہ ہے" اس پر برلبط ہنس پڑی اسکی ہنسی کیا تھی مانو کئی تاریک لخت چھڑ گئے ہوں، کچھ دیر بعد برلبط بولی ہاں شاہدہ انور کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ وہ ہر ایک کو چھیڑا کرتے ہیں، ابھی صبح ہی مجھے چھیڑ رہی تھے بھلا بتاؤ اگر امی دیکھ لیتیں تو کتنا بُرا ہوتا۔ اور برلبط کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ بکھر گئی شاہدہ نے منھ بنا کر کہا۔ موا بے شرم ہے"

برلبط نے میری کتابیں دیکھتے ہوئے کہا" شاہدہ اب تو انور کے آنیکا وقت ہے آج تو اس کا میچ ہے سات بجے تک مرے گا"

برلبط نے شاہدہ کو کہنی مار کر کہا۔ تو کیوں کوستی ہے وہ تو تیرا منگیتر ہے"

ہوں! میں اس کلموئے سے شادی کروں گی۔ شاہدہ حقارت سے بولی۔ مجھے بھی غصہ آگیا۔ جب سے کھڑا کھڑا اپنی بُرائیاں سن رہا تھا میں یہ کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔ تو کون بُری حسین ہے" برلبط مجھے دیکھ کر بھاگ گئی اور شاہدہ بھی مجھے گالیاں دیتی ہوئی اٹھ گئی۔ میں کپڑے بدل کر اس امید پر اندر گیا کہ شاید برلبط ہو۔ دالان میں آکر دیکھا نغمہ تخت پر بیٹھی ہوئی دوپٹے میں پھول نکال رہی تھی میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا برلبط کہاں ہے؟"

تجھے کیا واسطہ" نغمہ غصہ سے بولی۔ مجھے بھی غصہ آگیا میں نے اس کو سوئی چبھاتے ہوئے کہا، ہر وقت سنگھار ہی کی فکر رہتی ہے۔ کبھی اپنی قمیص سینے کو دیتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

کیا میں تیری لونڈی ہوں" وہ دوپٹہ رکھتے ہوئے بولی۔

میں نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ نہیں تو کیا بیگم صاحبہ ہیں"

نہ تو بیگم ہوں نہ لونڈی۔ وہ متانت سے بولی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا" ارے ہاں برلبا کدھر گئی"

پھر تو نے برلبا کا وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا" وہ عالمانہ انداز میں بولی۔ دیکھ انور! یہ بات اچھی نہیں۔ غیر لڑکی کا ذکر نہیں کیا کرتے۔ تیری شادی تو شاہدہ سے ہوگی۔ تو صرف شاہدہ ہی کا ذکر کیا کر"

بڑی خوبصورت ہیں نہ شاہدہ۔ میں جل کر بولا۔ اتنے میں شاہدہ دروازے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے دوڑ کر اس کے بازو پکڑ لئے۔ اور کہا۔ کیوں ری گیند برلبا سے میری کیا برائی کر رہی تھی"

وہ چلا کر بولی۔ دیکھو نجمہ باجی یہ مجھے ڈرا رہا ہے۔ نغمہ نے دوڑ کر دو چپت میرے سر پر رسید کئے۔ میں نے جواب میں ایک گھونسہ نغمہ کی پیٹھ پر دیا۔ اور وہاں سے کان دبا کر بھاگا نہ جانے یہ میری عادت تھی یا فطرت جبتک کسی کو ستا نہ لیتا چین ہی نہیں آتا تھا اس لئے بیچاری برلبا کو بھی چھیڑا کرتا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ کتراتی تھی۔ آج تک اس نے مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔ وہاں سے بھاگ کر میں ابا جان کے کمرے میں آیا۔ یہاں انجنیئر صاحب ابا سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ابا نے کہا۔

انور ابھی تک گھر میں کیا کر رہے تھے۔

ہسٹری پڑھ رہا تھا"

انجینیر صاحب ہنس کر بولے "ہمارا انور پڑھنے میں بہت محنت کرتا ہے۔ فرسٹ ڈویژن ضرور آئے گا۔ کیوں بیٹے؟"

"اجی جناب پاس ہی ہو جاؤں تو بہتر ہے۔ پڑھنا لکھنا کیا ہوتا ہے"

ابا غصہ سے بولے۔ "بڑے بدتمیز ہو گئے ہو انور"

"ابا جان۔ گستاخی معاف۔ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ کی صاحبزادیاں مجھے پڑھنے نہیں دیتیں۔ کبھی نغمہ صاحبہ فرماتی ہیں۔ انور آج سنیما چلیں گے۔ سلمہ صاحبہ کہتی ہیں مجھے کالج چھوڑ آؤ۔ میرے کالج میں جلسہ ہے۔ اگر ان کا حکم نہ مانوں تو سمجھ لیجئے ان کی سینڈل اور میرا سر"

میں نے ایک لمبی تقریر کرتے ہوئے کہا انجینیر صاحب تو میری بات سن کر مسکرائے البتہ ابا جان ذرا غصہ ہوئے۔ اور انجینیر صاحب سے بات بناتے ہوئے بولے "بہت نادان لڑکا ہے"

میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ دس پندرہ دن بعد ہماری امی محترمہ چھوٹی صاحبہ نغمہ نجمہ مہر وغیرہ شملہ چلی گئیں۔ گھر میں صرف ابا اور سلمہ رہ گئے۔ ان ہی دنوں مجھے بخار آنے لگا تھا۔ چنانچہ دوپہر کا وقت تھا ابا اسپتال جا چکے تھے۔ سلمہ اپنی پیاری سہیلی کوثر کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ میں تنہا تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد تھا۔ مجھے رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ کہ امی کو انہی دنوں شملہ جانا تھا جبکہ میں بیمار ہوں۔ کہنے کو تو کچھ نہیں لیکن یہ کام کی نہیں۔ ہماری بہنیں کون تھوڑی ہیں۔ جو یہ شاہدہ ستانے کے لئے مرتی۔ اور سلمہ کی بچی ابھی تک سہیلی کے یہاں سے واپس نہیں آئی۔ میں نے غصے سے سامنے رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ اتنے میں ابا داخل ہوئے۔

"پاگل تو نہیں ہو گیا انور۔ یہ کتابیں کیوں پھینک رہا ہے۔" وہ کتاب اٹھا کر بولے میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ابا نے دوا کی بوتل اٹھا کر کہا۔

"کیوں صاحبزادے! دوا پی لی؟" میں نے کراہیت سے ہاں " کہدی۔

"جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟" ابا دوائی اونڈیلتے ہوئے بولے۔ اور دوا میرے منھ میں ڈالدی اور چلے گئے۔ دوا کڑوی تھی میرا منھ بھی کڑوا ہو گیا۔ میں نے اٹھکر پانی پیا طبیعت الجھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک ٹہلتا رہا۔ پھر دروازے کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا ربط کے گھر کی طرف نگاہ ڈالی۔ ربط نظر آئی وہ باہر کرسی پر بیٹھی ہوئی کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ آج بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ لال ساٹن کا شلوار پہن رکھا تھا۔ اور اسی کا ہمرنگ قمیص۔ بالوں کے لچھے پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے شیطانی سوجھی۔ ایک کنکر اٹھا کر اسکی طرف پھینکا۔ وہ کنکر کتاب پر جا کر لگا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اندر بھاگ گئی۔ میں اپنے خیال میں مگن ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ میرے دوست آ رہے تھے۔ انھوں نے آتے ہی چھیڑنا شروع کر دیا۔ سب کے سب کہہ رہے تھے "بھئی مبارک ہو" میں چیں بجبیں ہو کر بولا "کیسی مبارک؟ کیا میں بیمار ہوں اس لئے مبارک باد دیتے ہو"

"نہیں جی! افضل بولا" پھر کیسی مبارک باد" میں نے کڑک کر کہا۔ سب کے سب ہنسنے لگے۔

جامی بولا "بڑے بیوفا ہو جی! انجم صاحب چھپکے انہیں اپنی خوبصورتی پر ناز ہے" شمیم صاحب جو کنے والے تھے وہ بولے "بھوپی کی لڑکی بدصورت ہے تو کیا ہوا" میں نے پریشانی سے کہا "ارے بھئی پہیلیاں تو نہ بجھواؤ۔ جاوید نے کہا! لو صاحب انھیں معلوم ہی نہیں"

"تمہارے سر کی قسم۔ میں بالکل نہیں جانتا" میں نے کہا۔

"ارے بھئی تم انجنیر صاحب کے داماد ہو گئے"

"اب ہمیں مٹھائی کھلاؤ" سب کے سب بولے۔ میں نے عاجز ہو کر کہا "ہاں

بھئی مٹھائی کھلا دیں گے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ مجھے تو بخار ہے اور تم کو مذاق سوجھ رہا ہے
سب کے سب قہقہہ لگا کر بولے "تو بھئی انور کو تو شادی کا نام سنکر بخار آگیا۔ ابھی انکا
قہقہہ ختم بھی نہوا تھا کہ ابا جان آئے۔ وہ ڈانٹ کر بولے۔ کیوں رے لڑکو! یہ قہقہہ
کیوں پڑ رہا ہے۔ انور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بھاگو یہاں سے" سب کے سب
بھاگے۔ جاوید نے جاتے وقت چٹکی لیکر کہا۔ یار مٹھائی تو ضرور کھاؤنگا" ابا کے چلے
جانے کے بعد میں سو گیا۔ کیونکہ مجھے نیند آگئی تھی۔ سات بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ سلمہ
دودھ لیکر آئی۔ اور بڑی محبت سے بولی۔ بھیا دودھ پی لو"

بھاگ یہاں سے" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرنے
لگی۔

آج تو بھائی سے بڑی محبت آرہی ہے" میں نے طعنے سے کہا۔

"ہاں ایک بات کہوں۔ بھیا مانو گے"

میں نے منہ بنا کر کہا۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنے والی ہیں۔ یہی کہیں گی کہ
بھیا مجھے ابا سے کہکر بنارسی ساری منگوا دو۔

وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ نہیں یہ کہوں گی کہ مجھے بھابی لادو"

وہی موٹی سی شاہدہ بھابی" میں نے جل کر کہا۔

اوہوں۔ دُبلی پتلی" نازک سی بر لیلا بھابی"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ نہایت محبت سے میرے گلے میں باہیں ڈال کر بولی
تمہیں بر لیلا پسند نہیں۔

مجھے بر لیلا پسند ہے نا شاہدہ۔ میں نے چڑ کر کہا۔

وہ تنک کر بولی" نہ جانے کونسی پری تمہاری بیوی بنے گی۔

۔۔ نہ مجھے پری چاہئے نہ چڑیل۔ تو یہاں سے بھاگ جا صبح سے مذاق کے لئے

صرف میں ہی رہ گیا ہوں۔ تم لوگ تو کیا چڑیل سے کم ہو جو ایک بلا میں اور اپنے سر منڈھ لوں۔ میں نے غصہ سے کہا وہ اٹھلاتی ہوئی بھاگ گئی۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا تھا کہ ربیطا سے میری شادی ہوگی۔ کیونکہ میری بہنیں اکثر مجھ سے مذاق کیا کرتی تھیں۔ آج پھر مذاق کیا ہو مجھے ربیطا سے محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ رات بھر میں انہیں خیالات میں غرق رہا۔ خواب میں بھی ربیطا نظر آئی۔ دوسرے دن اماں پھوپی وغیرہ آگئیں مجھے نغمہ سے سب حالات معلوم ہوگئے۔ بات اصل یہ تھی کہ میرے چال چلن دیکھ کر پھوپی نے شاہدہ سے بیاہ کرنے سے انکار کر دیا اسلئے میری شادی ربیطا سے قرار پائی میں تخت پر بیٹھا نغمہ سے باتیں کر رہا تھا۔ کہ شاہدہ آتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا:۔

گلینڈ تم تو اور پھول گئیں۔ یہ سنکر شاہدہ منہ بنا کر چلدی۔ نغمہ نے میرے کان میں کہا۔ "اور یہ تم سے ناراض ہے۔"

تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں نغمہ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا آیا۔ شام کو باہر کرسی ڈالکر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا میں نے ربیطا کے گھر کی طرف نظر اٹھائی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور ربیطا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی مرتبہ ربیطا مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ربیطا نے کھڑکی بند کر لی۔ میں نے شرارت سے دو چار پتھر کھڑکی اوپر مارے۔ لیکن کھڑکی نہیں کھلی۔ شام زیادہ ہو چکی تھی میں اٹھکر جانیوالا تھا کہ انجنیر صاحب نظر آئے۔ اور میرے پاس آکر بولے دل لگاکر پڑھا کرو بیٹا

آپ کی مہربانی سے میں دل لگاکر پڑھ رہا ہوں۔ میں نے طعنہ سے کہا۔

مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔"

انجنیر صاحب چلے گئے۔ میں اندر آیا۔ کمرہ میں نجمہ اور شاہدہ تھیں۔ نجمہ شاہدہ سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی تمہیں ربیطا نے بلایا ہے"۔ میں نے کہا کس کو بلایا ہے؟

آپ کو۔" نجمہ جل کر بولی میں بھی ایک حاضر جواب تھا۔ فوراً بول اٹھا۔
تو کھانا کھانے کے بعد چلا جاؤں گا۔ نجمہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ میں ابا کے کمرے
میں آیا۔ ابا جان اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے "
کیوں میاں اتنا اکڑتے کیوں ہو۔ انجنیر صاحب سے ٹھیک بات کیوں
نہیں کرتے ہو"
اب آپ ہی سکھا دیجئے کس طرح بات کروں۔ جی جناب تو کہتا ہوں۔ اگر
حکم ہو تو حضور والا۔ جناب عالی بھی کہا کروں"
بڑے بدتمیز ہوتے جا رہے ہو" ابا نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کی۔ میں وہاں سے
کھسک آیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا۔ اگر وہاں بیٹھوں گا تو ابا جان کی دو چار گالیاں
تو ضرور سننی پڑیں گی۔ اسی دن سے شادی کی بات چیت ہونے لگی اور تیاریاں بھی شروع
ہو گئیں۔ اسی دن سے ربط نے ہمارے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ انھیں دنوں شاہدہ کی طبیعت
خراب ہو گئی۔ اور پھوپی شاہدہ کو لیکر آگرہ چلی گئیں۔ میری شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی
تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے ہوئے عبدالحلیم شرر کی ناول پڑھ رہا تھا کہ کسی
نے دروازہ کھٹکھٹایا
کون ہے" میں لیٹے لیٹے بولا"
میں ہوں انور بھیا۔ ربط کے چھوٹے بھائی کی آواز آئی میں پلنگ سے اٹھتے ہوئے
بولا" تم ہو منے" اور دروازہ کھول دیا۔ منا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسنے میرے ہاتھ میں
ایک نیلے رنگ کا لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ باجی نے دیا ہے اور بھاگ گیا میں نے لفافے کو
الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر خط پڑھنے لگا خط میں تحریر تھا۔
انور"
مجھے تم سے ضروری باتیں کرتی ہیں۔ مہربانی فرما کر مجھے باغ میں ملئے۔ امید ہے کہ

میری درخواست قبول کریں گے۔

برلط۔

میں نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ مجھے غصہ آیا کہ ان کے لئے باغ جاؤں۔ جیسے ان کا غلام ہی ہوں۔

میں باغ میں نہیں گیا۔ دوسرے دن بازار سے آ رہا تھا کہ برلط کے بھائی نے مجھے پکارا۔ اور ایک خط لا کر دیا۔ میں نے اس کا کان پکڑ کر کہا۔ کیوں جناب یہ پوسٹ مین کب سے بن گئے" وہ چلایا۔ باجی! باجی! کھڑکی کھلی برلط نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کھڑکی بند کر لی۔ میں نے خط کھولا۔ گلابی کاغذ پر موٹے حروف سے لکھا ہوا تھا

انور۔

میں نے آپ کو بلایا اور آپ نہیں آئے جس کا مجھے بہت افسوس ہے
آپ سے ایسی امید نہ تھی۔

برلط

میں نے خط کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ گھر آ کر معلوم ہوا کہ بھابی کا خط آیا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ شاہدہ بہت بیمار ہے۔ نغمہ مجھے خط دکھا کر بولی "انور آگرہ نہیں جاؤ گے"

"لیکن کس لئے جاؤں" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ نغمہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ شاہدہ کی طبیعت خراب ہے۔ پھوپی کیا کہیں گی"

نغمہ کے کہنے سے میں مجبوراً آگرہ چلا گیا۔ اور جب میری شادی کو ایک دن رہ گیا واپس آیا۔ گھر میں بہت دھوم دھام تھی۔ تمام رشتہ دار آ گئے تھے۔ برلط کی کوٹھی بھی خوب سجائی گئی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا مستقبل پر غور کر رہا تھا۔

کہ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ برکھا کھڑی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساری پہن رکھی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ معصومیت اور غرور نے ملکر اس کے چہرے پر عجیب قسم کی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ برکھا مجھ سے یوں مخاطب ہوئی۔

جناب مجھ سے ایسی کونسی غلطی ہو گئی جس کی سزا دے رہے ہیں۔ میں نے جناب کو خط لکھکر بلایا لیکن آپ نہیں آئے۔ مجبوراً مجھے آنا پڑا۔ اور میں یہ کہنے آئی ہوں کہ میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔"

لیکن مجھ میں کونسا عیب ہے۔ میں نے غصہ سے کہا۔

آپ میں کوئی عیب نہیں۔ لیکن میں آپ کو کسی دوسرے سے نہیں چھیننا چاہتی آپ شاہدہ کے ہیں۔ شاہدہ بہن مجھ سے اسی لئے ناراض ہیں۔ میں اپنی بہن کو ناراض کرنا نہیں چاہتی۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ شاہدہ کا بیمار ہونے کا سبب آپ ہیں۔"

اگر میں شاہدہ سے شادی نہ کروں تو؟"

آپ ہرگز ایسا نہ کریں گے۔ وہ منت سے بولی۔ اس کے سمجھانے بجھانے سے میں راضی ہو گیا۔ اور شادی کے دن عین نکاح کے وقت انکار کر دیا۔ میرے انکار سے محفل میں کھلبلی پڑ گئی۔ انجنیر صاحب کو جب معلوم ہوا تو وہ میرے پاس آئے اور غصہ سے بولے "انور تم نے میری ناک کٹوا دی۔ میں تم کو اتنا نالائق نہ سمجھتا تھا۔ اگر تم اتنے نالائق ہو۔ یہ مجھے معلوم ہوتا تو میں کبھی یہ رشتہ منسوب نہ کرتا۔ آخر میری برکھا میں کیا کمی ہے۔ میں بدستور خاموش رہا۔ انجنیر صاحب نے مجھے بہت کچھ سمجھایا۔ ابا نے منتیں کیں۔ والدہ صاحبہ خفا ہوئیں۔ نغمہ نے مجھے لاکھ سمجھایا لیکن میں راضی نہیں ہوا آخر کار بات ٹوٹ گئی۔ انجنیر صاحب ہم لوگوں سے اتنے خفا ہوئے کہ دوسرے دن سب لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے کچھ دن بعد میری شادی شاہدہ سے ہو گئی۔ اب میں بھی اپنے والد صاحب کی طرح

ڈاکٹر تھا۔ کچھ مہینہ بعد میرا تبادلہ کانپور سے گوجرانوالہ ہو گیا۔ میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ اِس عرصے میں انجنیئر صاحب اور بربط وغیرہ کو میں بالکل بھول گیا تھا اب میں ایک ننھے بچے کا باپ تھا۔ میں نے اپنے لڑکے کا نام جمیل رکھا تھا۔ ایک دفعہ جبکہ میں اسپتال سے آیا ہوا تھا اور کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بڑی محبت سے گلے ملے وہ مجھ سے بہت محبت کر رہے تھے۔ وہ بولے ماشاءاللہ اپنے باپ کے تنومند ہو۔"

گستاخی معاف! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

قہقہہ لگا کر ہنسے "انور تم نے اپنے انجنیئر چچا کو بھی نہیں پہچانا۔

اوہ! آپ ہیں" میں بڑی گرم جوشی سے گلے ملا۔

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ میرے بچے کو بہت پیار کر رہے تھے۔ وہ میرے جمیل کو گود میں بٹھائے ہوئے بولے "بہت حسین بچہ ہے ہماری بربط کو بچے بہت پسند ہیں۔"

کہاں پر ہے بربط۔ میں نے سوال کیا۔

میرے ہی پاس ہے" وہ بولے۔ میں نے بربط کے بارے میں زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ انجنیئر صاحب نہ جانے کیا خیال کرتے۔ وہ تھوڑی بعد چلے گئے میں اندر آیا۔ شاہدہ کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی آج تو بڑے خوش ہو۔"

کچھ بھی نہیں" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا

کچھ تو ہے" اتنے خوش تو کبھی نہ تھے۔"

جلنے لگو گی۔"

میں کیوں جلوں۔" وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

تو کان کھول کر سنو۔" میں شاہدہ کے کان کے پاس منہ لیجا کر بولا۔ "بربط کے ابا

آئے تھے۔"

ہوں"۔ شاہدہ جاتے ہوئے بولی۔

میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "کیوں بریط کا نام سنکر بخار آ گیا۔"

دوسرے دن میری ملاقات انجینیر صاحب سے ہوٹل میں ہوئی۔ وہ مجھے اپنے پتے کا کارڈ دیکر بولے۔ "میرے گھر ضرور آنا۔"

شام کو میں انجینیر صاحب کے ہاں گیا۔ انجینیر صاحب گھر پر نہیں تھے۔ دس برس کا ایک لڑکا باہر آیا۔ بریط کا چھوٹا بھائی منا تھا۔ مجھے دیکھکر بولا "آپکو کیا کام ہے"

تمہارے ابا کہاں ہیں؟"

وہ تو کہیں گئے ہیں"۔ منا بولا۔

"گھر میں کون ہے؟"

میری بریط آپا ہیں"

اور تمہارے دولہا بھائی کہاں ہیں"میں سنجیدگی سے کہا۔"

وہ ہنستا ہوا بھاگا۔ میں آپا سے کہوں گا۔ میں نے کتنا روکا لیکن وہ رکا نہیں وہ اندر جاکر کہہ رہا تھا۔

باجی! کوئی باہر آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تمہارے دولھا بھائی کہاں ہیں؟"

کون بدتمیز ہے؟" بریط کی آواز آئی۔

چق اٹھی۔ بریط سامنے کھڑی تھی۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔ مدھ بھری آنکھیں مجھے دیکھ کر چق گرادی۔ بریط کے بھائی نے مجھے کمرہ میں بٹھایا۔

دوسرے کمرے سے آواز آئی "شاہدہ بہن کیسی ہیں"

"کون شاہدہ" میں نے انجان بن کر کہا۔"

"تمہاری بھابی"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "بہت اچھی ہیں تم کو یاد کرتی ہیں"

"شکریہ" بریطا نے کہا۔

"تم مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہو"

"یوں ہی"

میں نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا "میں تو غیر نہیں ہوں۔ اپنوں سے پردہ کیسا؟"

"لیکن میں پردے کی ضرورت سمجھتی ہوں"

"تمہاری مرضی" میں نے کہا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد میں بولا "تم نے شادی نہیں کی؟"

"کیا شادی کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟"

"نہیں تو" میں نے لاجواب ہو کر کہا۔

"پھر شادی کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم نے بہت بڑا ایثار کیا ہے" میں بولا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"مطلب تو صاف ہے۔ تم نے دوسرے کی شادی کے لئے اپنی خوشی قربان کی اپنا سب کچھ دوسرے کو دیدیا"

بریطا گلوگیر آواز سے بولی "بالکل غلط۔ آپ غلطی پر ہیں....."

پھر آواز نہیں آئی۔ بریطا کی بھائی نے ایک خط لاکر دیا خط کے اوپر موٹے حروف سے "شاہد" لکھا ہوا تھا میں نے خط جیب میں رکھ لیا اور اپنے گھر کی طرف چلدیا۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ سڑک پر بہت کم لوگ جا رہے تھے۔ میں اپنے خیالات کی رو میں بہتا ہوا نہ جانے کہاں چلا جا رہا تھا مجھے جب ہوش آیا جیب کسی نے بریطا کہا سیہ ایک فیشن ایبل نوجوان جسے انجنیئر صاحب کے ساتھ جا رہے تھی میں لپک کر گھر کی طرف جا تا

نفرت

میری اور مہتاب کی ملاقات ایک جلسہ میں ہوئی تھی۔ مہتاب خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ دبلی پتلی سرو قد۔ خط وخال اچھے۔ گندمی رنگت اور ہونٹوں پر کچھ کھلتی سی مسکراہٹ فکر و تفکر ہر وقت اس کے چہرے سے عیاں رہتے تھے۔ مہتاب زیادہ تو نہیں۔ تیس برس کی ضرور ہو گی۔ لیکن بشرے سے بیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ مہتاب نواب صاحب کی لڑکی ہونیکے باوجود نہایت سادہ لباس میں رہتی تھی۔ وہ مجھ سے مانوس ہو گئی تھی اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی ایک دفعہ جب کہ خوشگوار موسم تھا۔ میں چلمن کے پاس کھڑی اپنے گلاب کے پودوں کو دیکھ رہی تھی اور مالی کی لڑکی چمپا کو پودوں میں پانی ڈالنے کی ہدایت کر رہی تھی۔ کہ مجھے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے پھاٹک کی طرف نظر دوڑائی تو مہتاب نظر آئی۔ آج وہ سفید لباس میں آسمان کی پری معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہنے لگی۔

"تم کتنی اچھی ہو شکیں!!"

مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ مہتاب نے اس سے پہلے مجھ سے اس قدر محبت نہیں کی۔ آج کیا ہو گیا ہے اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ اور وہ بیہوش ہو کر میری گود میں گر پڑی۔ میں نے چمپا

کی مدد سے اسے بینچ پر لٹایا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اسے ہوش آگیا۔ اور وہ انگڑائی لیکر اٹھ بیٹھی۔ جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں نے کوشش کرکے پوچھ ہی لیا "مِس نواب آپ کو کیا ہو گیا تھا"؟

"میں مِس نواب نہیں بلکہ تمہاری بہن مہتاب ہوں"؟

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا کہ میں بیہوش کیسے ہو گئی۔ یہ بیماری مجھے بچپن سے ہے۔ اور واقعہ رونما ہو جانے کی وجہ سے میں اور پریشان رہتی ہوں۔ اور یہ دورے قریب قریب دو چار دن کے بعد پڑتے ہیں"

"واقعہ کیا ہے" میں نے دلچسپی سے کہا۔

ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی بولی "سنکر کیا کرو گی کوئی دلچسپ واقعہ نہیں ہے" میں نے التجا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شاید میرا مطلب سمجھ گئی مسکرا کر بولی "اچھا کل آنا میں ضرور بتاؤں گی"

اور وہ چلی گئی۔ دوسرے دن میں اس کے ہاں گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ کر رہی تھی۔ میرے آنے کی خبر سنکر دوڑی آئی۔ اور ہنسکر بولی "تم آگئیں شکر ہے"

"آپ کا کہا کیسے ٹالتی" میں نے کہا۔

"ہاں تم بڑی اچھی ہو" چلو میرے کمرہ میں چلو۔ یہاں نسرین کی سہیلیاں آنے والی ہیں۔

وہ مجھے اپنے کمرہ میں لے گئی۔ کمرہ مختصر فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دو چار کرسیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔ اور میز پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی کرسی کے پاس ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر ایک خوبصورت بچہ کی تصویر رکھی تھی۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کس بچہ کی تصویر ہے"؟

"بچہ نہیں ہے بلکہ ایک نوجوان فوجی افسر ہے" وہ ہنسکر بولی۔

"معاف کرنا مجھ سے غلطی ہوئی" میں شرمندہ ہو کر بولی۔

وہ چوڑیوں سے کھیلتی ہوئی بولی "میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اِن ننھے میاں کو ہم لوگ تسلیم کے نام سے یاد کرتے ہیں"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے سکوت توڑا "آپ نے مجھے اپنا واقعہ سُنانے کا وعدہ کیا تھا"

وہ رنجیدہ ہو کر بولی "سن کر کیا کرو گی۔ یہ خوشی کی چند گھڑیاں بھی مجھ سے چھن جائیں گی۔ مجھے تھوڑی دیر..... تو خوش رہنے دو۔

"آپ کو تکلیف ہو تو نہ سُنائیے"

"نہیں میری بہن! تم کو ضرور سُناؤں گی۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ وعدہ پھر کیوں وفا نہ کروں۔ میں تم پر پورا اعتماد کرتی ہوں۔ اس لئے کہہ رہی ہوں۔ ورنہ یہ واقعہ میں نے کسی سے نہیں کہا۔ حتیٰ کہ ابّا محترم کو بھی نہیں معلوم ہے"

کچھ دیر وہ تصویر کو گھورتی رہی۔ پھر بولی "انسان زندگی میں غم سے نجات کبھی نہیں پا سکتا۔ شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

انسان ہے کیا ہے محشر ہے خیالوں کا ۔۔۔ تصویر امیدوں کی آئینہ بلاؤں کا

ہاں تو میں اپنا قصہ شروع کرتی ہوں۔ تم نواب صاحب کو میرا باپ سمجھتی ہو گی۔ تمہیں کیا ساری دنیا مجھے نواب صاحب کی بیٹی سمجھتی ہے۔ لیکن یہ انکی غلطی ہے میں نواب صاحب کی لڑکی نہیں ہوں۔ نواب صاحب میرے چچا ہیں۔ میرے باپ جب میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی، مر گئے تھے۔ اور جب میں دو ماہ کی ہوئی تو میری ماں نے بھی رحلت فرمائی۔ اور نواب صاحب نے میری پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ اور مجھے اپنی بیٹی بنا لیا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور نسترن سے بھی زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔ دنیا کی ہر ایک خوشی و آرام میرے لئے تھا۔ لیکن افسوس میں اس سے لطف اندوز

نہیں ہو سکی۔ میں بچپن سے ایک موذی مرض میں مبتلا ہوں یعنی میری طبیعت کبھی کبھی گھبراتی ہے۔ اور ایسی گھبراتی ہے کہ میں بیہوش ہو جاتی ہوں۔ میرے چچا نے میرے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے تبدیلِ آب و ہوا کے لئے دور سمندر کنارے جانے کو کہا۔ میں اپنے چھوٹے بھائی تسلیم یعنی نوابصاحب کے لڑکے کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گئی۔"

تسلیم جب اٹھارہ برس کا جوان تھا۔ سمندر کے کنارے ایک مکان کرایہ پر ہم نے لے لیا۔ ہمارے بنگلہ کے کافی فاصلہ پر ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ تھا۔ یہی ڈاکٹر صاحب میرا علاج کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ضعیف شخص تھے۔ وہ بہت خاموش طبیعت واقع ہوئے تھے۔ وہ تنہا رہتے تھے۔ ان کے بیوی بچہ کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اکثر رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اور مجھے بیٹی کہکر پکارتے تھے مجھے بھی ڈاکٹر صاحب سے محبت ہو گئی تھی میں نے کئی دفعہ ان کے غمگین ہونے کا سبب پوچھا۔ وہ یہ کہکر ٹال دیتے۔ پگلی تمام دنیا غمگین ہے۔ میں اکیلا غمگین نہیں ہوں۔ اور تو بھی رنجیدہ رہتی ہے"

میں چڑکر جواب دیتی" واہ میں تو ہر وقت ہنستی رہتی ہوں"

"بیٹی! ہنسنے سے کوئی خوش نہیں ہو سکتا۔ خدا نے تو ہم لوگوں کو غم ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔ کوئی اپنے غم کو ہنسی خوشی کے اوٹ میں چھپا لیتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں کرتا۔ دنیا اس کو غم زدہ کہتے ہیں"

میں لاجواب ہو کر خاموش ہو جاتی۔ میری ہزار کوشش پر انھوں نے کچھ نہ بتایا۔ یہاں آنے سے مجھے کچھ افاقہ ہو گیا تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت سمندر کے کنارے گذارتی۔ راتکو بھی کبھی طبیعت الجھنے لگتی تو سمندر کنارے چلی جاتی۔ ایک دفعہ جبکہ قمر چہاردہم آسمان پر جلوہ افروز تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی فرحت بخش ہوائیں آ رہی

تھیں۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ میری طبیعت الجھنے لگی۔ میں سمندر کنارے دل بہلانے کو چلدی۔ یہاں میں نیلے پانی سے اپنا دل بہلا رہی تھی کہ مجھے کچھ بات کرنے کی آواز آئی۔ مجھے خیال آیا کہ اتنی رات کو کون آسکتا ہے۔ پھر یہ کہکر تسلی کرلی کہ میری طرح ابھی کوئی قدرت کے ہاتھوں کا ستایا ہوگا۔ میں نے مڑکر دیکھا تو سائے فضا میں غائب ہوتے ہوئے نظر آئے۔ اس میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ مرد کی چال ڈھال بھائی تسلیم سے ملتی جلتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ تسلیم یہاں کیسے آسکتا ہے۔ وہ تو سو رہا ہوگا۔ یہ تو میرا وہم ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں چلی آئی۔ صبح جبکہ میں بال بنا رہی تھی تسلیم نے مجھ سے کہا۔

"باجی! آپ اتنی رات گئے سمندر کے کنارے کیوں جاتی ہیں"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا"

وہ سنجیدگی سے بولا "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے"

میں بولی۔ ہاں! تو کیا وہ کل رات کو سمندر کے کنارے.....

"کیا کہا باجی آپ نے"

میں بات بناتے ہوئے بولی "کچھ نہیں" "لیکن رات کو سمندر کنارے جانے سے کیا ہوا؟"

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ رات کی ہوا آپ کے لئے مضر ہے۔ کل سے نہ جایا کیجئے"

میں نے ربن ڈالتے ہوئے کہا "اچھا بھیا نہ جایا کروں گی۔ لیکن مجھے تیری باتیں بناوٹی معلوم ہوتی ہیں۔ سمندر کنارے جانے سے تو میری طبیعت بہل جاتی ہے" ڈاکٹر صاحب کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے"

وہ روٹھ کر بولا "باجی تمہیں تو ہماری بات کا یقین نہیں آتا۔ جیسے ہم جھوٹے ہیں۔ تم خود ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لو"

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اپنے بھیا پر یقین ہے۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ میں دو چار دن سمندر کنارے نہیں گئی۔ ایک دن میری طبیعت بہت گھبرانے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بیہوش نہ ہو جاؤں۔ اس لئے میں سمندر کنارے چلی گئی۔ مجھے چاند کی روشنی میں کوئی نظر آیا۔ میں نے پاس جاکر دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔

"تم یہاں کیسے آئیں"

میں بولی: "ڈاکٹر صاحب طبیعت گھبرا رہی تھی اس لئے چلی آئی"

"ہاں تمہارے لئے سمندر کی ہوا بہت مفید ہے"

مجھے ایک دم خیال آیا کہ تسلیم تو کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے سمندر کی ہوا مضر بتائی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ تسلیم مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے کہہ دیا ہوگا کہ اتنی رات کو میں سمندر کنارے نہ جایا کروں۔ کیونکہ ایک شریف عورت کے لئے خطرہ ہے۔ کیونکہ بمبئی میں بہت غنڈے تھے۔ میں تھوڑی دیر بعد گھر چلی آئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تسلیم گھر میں نہیں ہے۔ میں اس کے کمرہ میں گئی اور کمبل اٹھا کر دیکھا واقعی تسلیم نہیں تھا۔ میں نے یہ کہکر دل کو تسلی دے لی کہ سیر کرنے گیا ہوگا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اور تسلیم اندر داخل ہوا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ میں نے تسلیم کو دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ خون سے آلودہ ہیں۔ اور ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر ہے۔ اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ میں سمجھی کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ پھر مجھے ہوش آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تسلیم تو کسی کا خون کرکے آیا ہے"

"ہاں" وہ گرج کر بولا۔

میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کس غریب کا خون کیا ہے"

وہ اسی انداز میں بولا "سمندر کنارے جا کر دیکھ لو۔"

میں سمندر کنارے بھاگی۔ سمندر کنارے جا کر میں نے کیا منظر دیکھا۔ بیان نہیں کر سکتی ایک حسین دوشیزہ جس کے جسم میں تمام دنیا کی رعنائیاں سمٹ کر آگئی ہیں سفید پوشاک میں وہ آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اس دوشیزہ کے سینے میں شگاف تھا اور خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اور دوشیزہ بیہوش تھی۔ اور ڈاکٹر اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اسے اپنے گھر کی طرف لیجا رہے تھے۔ شائد علاج کرنے میں فوراً لوٹ آئی تسلیم سر جھکائے بیٹھا تھا میں نے اس کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "تسلیم تو نے یہ کیا کیا؟"

"وہ جو مجھے کرنا تھا۔ ایک بیوفا عورت کا یہی انجام ہے"

میں تڑپ کر بولی "اس نے تجھ سے کیا بیوفائی کی تھی؟"

"سنو گی" وہ مجھے گھور کر بولا۔

ہاں" میں نے سر جھکا کر کہا۔

تم نہیں جانتی باجی! وہ کتنی بیوفا ہے۔ اس نے میری دنیا برباد کر دی۔ میرے ارمانوں میں آگ لگا دی۔ اگر مجھے ایسا معلوم ہوتا تو اس سے کبھی محبت نہ کرتا۔ میں سب کچھ بتا دوں گا جس کی لڑکی کو آپ نے دیکھا ہے اس کا نام نمکین ہے۔ وہ سمندر کنارے ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ بہت غریب ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ایک بڑھیا نے اس کی پرورش کی ہے۔ ایک دفعہ میں سمندر کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے گیا۔ یہ لڑکی وہاں پر بیٹھی تھی۔ اس کی زلفیں شانوں پر پھیلی تھیں۔ یہ سراپا حسن کا مجسمہ بنی بال سکھا رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نہ جانے یہ لڑکی مجھے کیوں اچھی سی لگتی تھی جب اس کے ساتھ والی لڑکیاں چلی گئیں۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔ اے لڑکی پانی میں میری ایک چیز گر گئی ہے۔ ذرا نکال تو دو۔ وہ میرے پاس آ کر بولی۔ کہاں؟

میں نے پانی میں اس کے عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہی وہ چیز ہے اور اسے پانی میں دھکیل دیا۔ اور وہاں سے بھاگ گیا۔ رفتہ رفتہ میری اور اسکی جان پہچان ہو گئی۔ دن کے وقت تو ہم مل نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہم رات کو سمندر کنارے ملتے یہ لڑکی بہت عقلمند تھی۔ اکثر ہم دونوں میں علمی گفتگو ہوا کرتی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے علمی شوق کو دیکھ کر میں نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ مجھے غریبوں سے بہت ہمدردی ہو گئی۔ اور ہم دونوں نے سوچا کہ غریبوں پر جو مظالم ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں کتاب لکھیں۔ چنانچہ ہم نے ایک کتاب لکھی۔ اس کا نام میں نے غریبوں کی دنیا رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔" آپ نے بھی تو پڑھی ہو گی یہ کتاب"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا "میں تمکین کو بہت بھولی بھالی لڑکی اور... پاکدامن سمجھتا تھا۔ لیکن آج میں نے کیا دیکھا کہہ نہیں سکتا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سمندر کنارے پتھر پر ٹکا بیٹھا تھا۔ اور اسکی گود میں تمکین کا سر تھا۔ اور وہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں غصے سے آگ بگولا ہو گیا کیونکہ میں تمکین اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر سے محبت کرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی میں نے جا کر اس کے کلیجے میں خنجر بھونک دیا۔ وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اور میں وہاں سے چلا آیا مجھے امید ہے کہ وہ مری نہیں۔ کیونکہ خنجر کلیجے تک نہیں پہنچا ہے۔ میں خونی ہی سہی لیکن اب میرے دل کو اطمینان ہے۔ میں نے ایک بیوفا سے بدلہ لے لیا۔ مجھے اس سے نفرت ہے"۔

تسلیم خاموش ہو گیا وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی غصہ اور نفرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اور سانس جلدی جلدی چل رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

تسلیم۔ تم خونی نہیں ہو۔ تمہیں خونی کون کہتا ہے۔ تمکین زندہ ہے۔ پھر تم خونی کیسے ہو سکتے ہو۔ خدا کے واسطے یہ کسی پر ظاہر نہ کرنا کہ تم نے تمکین کا خون کیا ہے۔ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ کہ نواب صاحب کا لڑکا خونی ہے۔ تم اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے۔ اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہو۔ اگر ابا کو معلوم ہو گیا تو وہ روتے روتے جان دیدیں گے۔"

وہ میری گود میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔ میں نے اسکو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ تم بہت بیوقوف ہو۔ ڈاکٹر پر الزام لگاتے ہو۔ وہ اتنے بوڑھے ہو کر محبت کریں گے وہ تو ان کی بیٹی کی برابر ہے۔ ڈاکٹر شریف ہیں۔ تم کو ان پر تہمت لگاتے شرم نہیں آتی۔ وہ مجھے بھی چاہتے ہیں تو کیا میں کہہ دوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں میرے غصے کی وجہ سے آنسو نکل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد میں بولی۔

"تم غلطی پر ہو۔ تم نے غصہ میں اندھے ہو کر ایک معصوم لڑکی کا خون کیا ہے۔ تم نہیں جانتے عورت کا دل کیسا ہوتا ہے۔ عورت کے حصہ میں مہر و وفا آئی ہے وہ بھلا بے وفائی کیسے کر سکتی ہے۔ تم نے تمکین کو سمجھنے میں غلطی کی وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ کیا ہم لوگوں کے لئے یہی انصاف ہے کہ ہم آپ لوگوں پر مرمٹیں۔ اور آپ ذرا سے شک پر قتل کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ کیا ہم لوگوں کا کچھ حق نہیں ہے۔ جب آپ لوگ ہم سے بیوفائی کرتے ہیں تو ہم جگر پر پتھر رکھ لیتے ہیں۔ آنسوؤں کو پی جاتے ہیں۔ آہوں کو دبا لیتے ہیں۔ اسکا صلہ ہمیں یہی دیا جاتا ہے۔" میں غصہ سے دیوانی ہو کر بولی۔

تسلیم نے میرے چہرہ پر نظریں گاڑ کر کہا۔ "کچھ بھی ہو۔ میں تمکین سے نفرت کرتا ہوں۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں تسلیم سے ناراض تھی۔ اس سے بات بھی نہیں کی۔ صبح میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ میں ڈاکٹر کے یہاں پہنچی وہ کمرہ میں تھے۔ مجھے کمرہ میں بلا لیا۔ کمرہ میں جا کر میں نے ایک دردناک منظر دیکھا جس کی یاد

میرے دل میں اب بھی باقی ہے۔ پلنگ پر ایک دوشیزہ پڑی تھی۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ حُسن پھیکا پڑ چکا تھا۔ سینہ میں ایک گہرا زخم تھا۔ دوشیزہ بیہوش تھی۔ در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ سرہانے ڈاکٹر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنسو اس کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر نہایت تپاک سے بٹھایا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے میں بولی۔

"ڈاکٹر صاحب یہ کون ہے؟"

ڈاکٹر صاحب مری آواز سے بولے۔" مریض ہے۔ کل رات کو یہ کہیں سے آیا ہے جب سے یہ بے ہوش ہے"

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں چلی آئی۔ تسلیم کہیں گیا ہوا تھا۔ دوپہر کو آیا میں نے اسے تمام واقعات سُنائے۔ میرا خیال تھا کہ وہ رنجیدہ ہو جائیگا لیکن اسکے برخلاف وہ مُسکرانے لگا۔ میں نے خفا ہو کر کہا۔ کسی کی بیکسی پر آنسو بہانے کے بجائے تم خوش ہو رہے ہو کسی کا دل جل رہا ہو اور تم مسکرا رہے ہو۔ کیا تمہارے سینے میں دل نہیں۔ کیا تم کو اس سے محبت نہیں"

وہ غرور سے بولا" میں کب اس سے محبت کرتا تھا کبھی کرتا ہوں گا لیکن اب میں اس سے نفرت کرتا ہوں نفرت"۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ مجھے اس کے ہنسنے سے غصہ آگیا۔ میں نے جل کر کہا۔

ہنس لو۔ خوب ہنس لو۔ ایک معصوم لڑکی کی بے بسی پر۔ اب تو ہنسنے کے دن آئیں گے ہی۔ یاد رکھو تم برباد ہو جاؤ گے۔ جو دوسروں پر ہنستا ہے وہ اپنے آپ پر ہنستا ہے"۔ تھوڑی دیر بعد میں بولی۔" تسلیم مجھے یقین ہے کہ تم تمکین سے محبت کرتے ہو۔ تمہارے قہقہوں میں خوشی کا ترنم نہیں بلکہ غم کی پکار ہے۔ مجھ سے تم چھپاتے کیوں ہو۔ تمہیں اس سے ضرور ہمدردی ہے"

تسلیم ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ باجی! تم مجھے پاگل بنا دوگی میں کتنی بار کہوں کہ اس سے نفرت کرتا ہوں۔ نفرت نفرت"........ اور وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ میں سر تھام کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر تک وہ قہقہہ لگاتا رہا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ترس آنے لگا۔ دوسرے دن تمکین کو ہوش آ گیا۔ میں تمکین کو دیکھنے ڈاکٹر کے یہاں روز جاتی تھی۔ مجھ سے شاید اسکو محبت ہو گئی تھی۔ جبتک میں اس کے پاس بیٹھی رہتی وہ پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھا کرتی۔ مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی تھی اور اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ میں اسی کے پاس گزارتی تھی۔ تمکین کو بولنے کی طاقت نہیں تھی اس لئے وہ خاموش لیٹی رہتی اس کے بچنے کی بہت کم امید تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس کو بچانے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ایک دفعہ میں اس کو دیکھنے گئی۔ آج اس کی حالت خراب تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس کے پاس سے پل بھر کے لئے ہٹ نہیں رہے تھے۔ آج وہ بہت رنجیدہ معلوم ہو رہے تھے۔ ایک ضروری کیس آجانے کی وجہ سے وہ مجبوراً جانے کے لئے تیار ہو گئے وہ مجھ سے کہتے گئے "تمکین کا خیال رکھنا"۔

"آپ گھبرائیے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں تمکین کا پورا خیال رکھوں گی"۔ میں نے ڈاکٹر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ چلے گئے۔

بہت کوشش کرنے کے بعد تمکین مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس کی آواز میں درد تھا۔ وہ کہہ رہی تھی آپ کتنی پیاری ہیں میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ میں نے شاید کہیں آپ کو دیکھا ہے"۔

"میں تسلیم کی بہن ہوں"۔

تسلیم کا نام سنکر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تسلیم کو میں نے بہت لعنت ملامت

کی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

کاش وہ بتا دیتے کہ انھوں نے مجھے کون سے قصور کی بنا پر زخمی کیا ہے۔ اب تو میرے موت کا پیام آ گیا ہے۔ کاش میں ان کو مرنے سے پہلے دیکھ سکتی۔ اور پوچھ سکتی کہ میرا قصور کیا ہے۔ اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے میں نے اس کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔

میری بہن! تیرے رونے سے فرشتے بھی کانپتے ہیں۔ آہ! جس نے تمہارے ساتھ بیوفائی کی تم اس کو یاد کر رہی ہو۔ تم اس کے نام پر تھوک کیوں نہیں دیتیں۔ اس ظالم کے لئے رو رہی ہو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں آگے نہ کہہ سکی اور میرے فرطِ غم سے آنسو نکل آئے۔ وہ بدستور مسکرا کر بولی "بہن تم نے کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ اس لئے نہیں جانتیں"

میں نے حقارت سے کہا۔ محبت۔ محبت کیا ہے ایک سنہرا جال ہے جس میں پھنسنے کے بعد انسان کبھی نہیں نکل سکتا۔ اس کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے والے کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان سب باتوں کے باوجود ہم کیوں محبت کریں۔ وہ غم کی وجہ سے بیہوش ہو گئی۔ میری بہت کوشش کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور سانس آہستہ آہستہ چل رہا تھا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن طاقت گویائی نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ بول سکی۔ صرف ایک محبت بھری نظر سے میری طرف دیکھا میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں تسلیم کو ضرور لاؤں گی"

اس نے احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں تھوڑی دیر بعد چلی آئی تسلیم برآمدہ میں بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ باجی کہاں گئی تھیں میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا"

میں غصہ سے بولی "میں تمہارے ساتھ کھانا نہیں کھانا چاہتی"

"لیکن کیوں۔" وہ التجا سے بولا۔

"پوچھ رہے ہو کیوں تم جیسے ظالم کے ساتھ میں رہنا بھی گوارا نہیں کرتی تم کتنے بیوفا ہو ایک معصوم لڑکی تمہاری یاد میں تڑپ رہی ہے۔ اور تمہارے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ تم جیسے نوجوان پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مرجاتے۔"

"خدا کے واسطے باجی کچھ تو کہئے میں سمجھا نہیں۔"

میں نے تمام واقعات اسے سنائے۔ پھر کہا تسلیم! مجھے امید ہے کہ تم میری خواہش کو نہ ٹھکراؤ گے۔ بہن کا حق بھائی پر بہت کچھ ہوتا ہے۔ میں تم سے التجا نہیں کررہی ہوں۔ بلکہ حکم دے رہی ہوں۔ اُسے جاکر دیکھ آؤ وہ چراغ سحری ہے" میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ خاموش تھا۔ میں نے اس کے شانے ہلاتے ہوئے کہا "بولو"

وہ آہستہ سے بولا" باجی میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں اُسے دیکھنے جاؤں۔"

تسلیم سے مجھکو ایسے روکھے جواب کی امید نہ تھی۔ میں غصہ سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ میں نے ایک زنّاٹے دار چپت تسلیم کے گال پر رسید کی۔ وہ ہنس کر بولا تم کتنی ہی چپت ماردو میں بُرا نہ مانوں گا۔ مجھ پر آپ کا سب کچھ حق ہے آپ جو چاہیں حکم دے سکتی ہیں میں بخوشی بجالاؤں گا۔ لیکن میری باجی وہاں جانے کے لئے مجھے مجبور نہ کیجئے اگر زیادہ مجبور کریں گی تو میں نہیں بلکہ میری لاش وہاں جائے گی۔"

میں ڈر گئی کہ واقعی! یہ کہیں اپنی جان نہ دیدے۔ اس لئے میں نے زیادہ مجبور نہیں کیا۔ دن بھر میں نے اس سے بات نہ کی۔ مجھے اس پر بہت غصہ آرہا تھا رات کو بھی مجھے الجھن بے چینیوں کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ میرے خیال سے تسلیم بھی نہیں سویا۔ کیونکہ وہ پلنگ پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا۔ اور ایک دبی سی آواز اس کے منہ سے

نکل جاتی تھی۔ مجھے پورا الیقین ہو گیا کہ وہ تمکین سے محبت کرتا ہے وہ مجھے صرف بہلا رہا ہے۔ تسلیم کی محبت بھی عجیب تھی۔ کیا محبت کے معنی نفرت ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو تسلیم تمکین سے ضرور محبت کرتا ہے۔ میں یہی سب پڑی پڑی سوچتی۔ ہی صبح کو میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ میں نے آج بھی تسلیم کو کتنا سمجھایا۔ لیکن وہ راضی نہوا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ آج مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے فضا پر اداسی چھائی ہوئی ہو۔ نہ جانے کیوں آج میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میں نے جوں ہی ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں قدم رکھا۔ ایک آہ سنائی دی۔ ڈاکٹر صاحب رو رہے تھے اور تمکین نے آخری ہچکی لی۔ اور ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی۔ میرے کلیجے پر چھریاں سی چلنے لگیں اور ایک درد بھری آہ میرے منھ سے نکل گئی۔ اور میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔ میرے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق مجھے دو دن بعد ہوش آیا جب مجھے ہوش آیا ڈاکٹر صاحب کی گود میں میرا سر تھا۔ اور وہ میرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے غم و ملال ٹپک رہا تھا۔ ان کی بے بسی دیکھکر مجھے بھی رونا آگیا۔ وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے رو رہی ہو۔ بیٹی! مجھے دیکھو میں کہیں رو رہا ہوں۔ مجھے تو رونا چاہیے۔ کیونکہ میری خوشی کی دنیا چھین لی گئی ہے۔ میرے باغ مسرت کا پھول مرجھا گیا ہے۔ میری بیٹی مجھ سے بچھڑ گئی ہے پھر بھی میں مسکرا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب بے اختیار رونے لگے۔ مجھے بھی رونا آگیا تھوڑی دیر بعد میں بولی۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب تمکین تو ایک غریب لڑکی تھی۔ اس کے باپ مر چکے تھے۔"

ڈاکٹر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "واقعی میں اس کے لئے مر چکا تھا۔ اگر زندہ ہوتا اپنی بیٹی کی خبر نہ لیتا۔ آہ! میں بد نصیب مر کیوں نہیں گیا۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ کیا معمہ ہے میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے حسرت سے کہا "ہاں یہ ایک معمہ ہے۔"

میں نے ان کے گلے میں باہیں ڈالکر کہا۔ "مجھ سے بیان کیجئے۔"

وہ مجھے گلے لگاکر بولے "تو میری بیٹی ہے۔ مجھے تجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنی تمکین سے مجھے محبت تھی۔ میں بیٹی ہی سمجھ کر تم سے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ نہ کہتا۔ تم میری بربادی کی داستان سنکر آنسو نہ بہانا۔ بلکہ قہقہہ لگانا۔ کیونکہ میں اسی کے قابل ہوں میں بدنصیب جس گھڑی سے پیدا ہوا ہوں۔ جب سے رنج و غم میرے لئے ہیں میں ایک ڈاکٹر کا لڑکا تھا۔ میرے والد افریقہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے صرف مجھے ایک دفعہ دیکھا تھا۔ میں محبت پدری سے بہت کم آشنا ہوں۔ جب میں چار برس کا تھا میرے والد کا انتقال افریقہ میں ہوگیا۔ میری والدہ کو بہت رنج ہوا۔ وہ میرے والد سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ انھیں کے غم میں وہ بیمار ہوگئیں اور دو ماہ بعد وہ بھی جنت سدھار گئیں۔ میری پرورش میرے ماموں جان نے کی۔ میرے ماموں جان مجھے اپنے لڑکے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی جبین تھی۔ جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی میرے ماموں ایک معمولی ڈاکٹر تھے۔ میری والدہ نے مرتے وقت میرے ماموں کو وصیت کی تھی کہ وہ مجھے ایک کامیاب ڈاکٹر بنائیں گے۔ کیونکہ یہ میرے باپ کی بھی آرزو تھی۔ ماموں مجھے بہت توجہ سے پڑھا رہے تھے۔ اور میں بھی دل لگاکر پڑھ رہا تھا۔ چنانچہ اٹھارہ برس کی عمر میں میں نے بی۔ اے کرلیا۔ میرے چچا کی لڑکی جبین بہت خوش اخلاق اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ مجھے اس سے انس سا ہوگیا تھا۔ میرے ماموں کا خیال تھا کہ مجھے ولایت بھیجیں۔ چنانچہ ولایت جانے سے پیشتر انھوں نے میری شادی جبین سے کردی۔ کیونکہ میرے جیسا انھیں لائق داماد نہ ملتا۔ شادی کے دو ماہ بعد میں ولایت جانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ رخصت کے وقت جبین بہت روئی اور مجھ سے التجا کی کہ میں اسے کبھی فراموش نہ کروں۔ میں نے بھی وعدہ کرلیا۔ کہ میں اسکی یاد کو امانت سمجھکر اس میں کبھی خیانت نہ کروں گا۔ پھر میں ولایت روانہ ہوگیا۔ جبین کے خط برابر آتے۔ اور میں ان کا جواب دیتا۔ اس کے خط سے مجھے

معلوم ہوگیا کہ میرے والد انتقال ہوا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی بلکہ یک خط آنے بند ہو گئے میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب ندارد۔ تار دیئے لیکن کچھ فائدہ نہوا۔ روپیہ برابر آتا رہا۔ میری پڑھائی کا آخری سال تھا کہ روپیہ آنا بھی بند ہو گیا۔ مہینے دو مہینے ہو گئے لیکن روپیہ نہ آیا۔ مجھے سخت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار میں نے تعلیم ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مجھے بہت افسوس تھا۔ کیونکہ اس سال پڑھنے کے بعد میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہوتا۔ میری ویسی حالت تھی جیسی حالت اُس تشنہ لب کی ہو جس کے آگے سے پانی کا بھرا پیالہ ہٹا لیا گیا ہو۔ ہمارے میڈیکل کالج کے پرنسپل مسٹر ایم رضوی مجھ پہ بہت مہربان تھے جب اُنکو میرا حال معلوم ہوا تو انھوں نے میرا بار اپنے سر لے لیا۔ ہمارے پرنسپل کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکا پاگل تھا اور لڑکی نیویارک میں تعلیم پاتی تھی رضوی صاحب مجھے اپنے بیٹے اقبال کیطرح چاہتے تھے۔ اب میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھا خاص کر دل کا علاج تو بہت اچھی طرح کرتا تھا۔ تنہائی کی وجہ سے میں اکثر پریشان رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے جبین کو دل سے بھلا دیا۔ ہمارے سرپرست کی لڑکی نشاط جو نیویارک میں تعلیم پاتی تھی تعلیم سے فراغت پا کر ولایت واپس آگئی تھی۔

نشاط بھی ڈاکٹر تھی۔ نشاط بلا کی شریر تھی۔ اکثر مجھے تنگ کیا کرتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ نشاط سے شادی کر لوں کیونکہ نشاط صورت شکل میں جبین سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ بھی میرے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ میں ایسا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ جب میں اپنے خیالات اس پر ظاہر کردوں۔ ایک مرتبہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی افسانہ پڑھ رہا تھا۔ نظریں کتاب پر تھیں لیکن خیالات نہ جانے کہاں پر تھے۔ میں خیالات میں غرق تھا کہ کسی کے نرم و نازک ہاتھوں نے میری آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ہاتھ ٹٹولا۔ نشاط کے ہاتھ تھے برف سے سرد ہاتھ مجھے مدہوش بنا رہے تھے۔ میں نے کہا نشاط "

ہاتھ فوراً ہٹ گئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی

معاف کرنا نیاز میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔"

"کوئی بات نہیں" میں بولا۔

وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔ کیا آپ اپنا قیمتی وقت میرے لئے صرف کر سکتے ہیں۔"

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔" میں نے خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"میں شادی کر رہی ہوں۔"

مجھ پر جیسے بجلی گر گئی ہو۔ میں سنبھل کر بولا۔ "ضرور کرو شادی ہم بھی تو دیکھیں وہ مبارک دن۔"

وہ اداس ہو کر بولی۔ "لیکن میں شادی کرنا نہیں چاہتی ہوں۔"

کیوں۔" میں نے تعجب سے کہا۔

بات اصل یہ ہے کہ میرے والد میری شادی آپ سے کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتی۔ مجھے تو خوش ہونا چاہئیے کہ آپ جیسا عقلمند شوہر مل رہا ہے لیکن میں شادی سے نفرت کرتی ہوں۔ میں عمر بھر کنواری رہنا چاہتی ہوں۔ میں ابا جان سے نہیں کہکر ان کی امیدوں پر پانی پھیرنا نہیں چاہتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ ابا سے انکار کر دیں گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا آئے۔ میرا دل بھی بے چین ہو گیا میں نے کہا کہ "نشاط" میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں انکار کر دوں گا۔"

وہ یہ سنکر کھل سی گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد چلی گئی۔ میں نے کہنے کو کہہ دیا تھا لیکن میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ رات کو کھانے پر رضوی صاحب نے مجھے بلایا۔ ان کے پاگل صاحبزادے بھی کھانے پر تھے۔ آج نشاط کچھ اداس معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بادامی ساری میں بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔ اور بیٹھ گیا کھانے کے دوران میں نشاط خاموش تھی۔ آخر میں نے سکوت توڑا۔

"نشاط آج بہت خاموش ہیں"
رضوی صاحب بولے "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ چہکتا بلبل آج خاموش کیوں ہے؟"
نشاط بگڑ کر بولی "پاپا! مجھے یہ پسند نہیں۔ روز تو قہقہہ لگایا کرتی ہوں۔ اگر آج خاموش ہوں تو کیا ہوا۔"
ان کے پاگل بھائی جو مرغ کا گوشت چمچہ کے ذریعہ بڑی جلدی جلدی کھا رہے تھے بولے "پاپا! میں نشاط کے دماغ کا پارہ پھر اسی درجہ پر چڑھ گیا۔"
ہم لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ نشاط غصہ ہوگئی۔ اور پاگل بھائی کے سر پر ایک چپت دی۔ وہ نشاط کے پیچھے بھاگا۔ دونوں کے چلے جانے کے بعد رضوی صاحب نے بتایا کہ اقبال کس طرح پاگل ہوا ہے۔ اقبال نشاط سے چار سال بڑا ہے۔ وہ ڈاکٹری پڑھتا تھا اسی میں اس کا دماغ بہک گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک اقبال کے بارے میں دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ پھر رضوی صاحب بولے۔
نیاز میں تمہارے ذمہ ایک ہستی سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ قبول کروگے یعنی میں اپنی پیاری نشاط کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ بولے "جواب دو"
میں جرأت کر کے بولا "لیکن میں نشاط سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"
"کیوں" رضوی صاحب غصہ میں بولے۔
"نشاط مجھے پسند نہیں"
وہ گرج کر بولے "تم کو میری بیٹی میں کیا برائی نظر آئی۔ کیا وہ حسین نہیں ہے؟ کیا وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے۔
میں خاموش رہا۔ وہ مجھے جھنجھوڑ کر بولے جواب دو۔ میں نے بھول کی جو تمہاری

پرورش کی۔ تم جیسے احسان فراموش دنیا میں پیدا کیوں ہوتے ہیں۔ وہ غصّہ سے میز پر مکّا مار رہے تھے۔ اور جانے کیا کیا بک رہے تھے۔ میں اٹھکر چلا آیا۔ دوسرے دن نشاط میرے پاس آئی۔ وہ بہت اداس تھی۔ مجھے دیکھکر وہ رونے لگی۔ میں نے کہا "کیا ہوا نشاط"

وہ آنسو پوچھ کر بولی معاف کرنا نیاز تمھیں میری خاطر بہت ذلّت اٹھانی پڑی۔ میں آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔ کل آپ کے جانے کے بعد وہ دیر تک آپ کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نیاز کا منھ کبھی نہ دیکھوں گا۔ آج ہم لوگ نیویارک جا رہے ہیں۔

"تو کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"ہاں" نشاط بولی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ چلی گئی۔ اسی دن نشاط اور اس کے والد نیویارک چلے گئے۔ ولایت میں میرا دل اُچاٹ ہوگیا۔ اب دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ بیوی اور ماموں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ایک مخلص ملے تھے وہ بھی یوں بدگمان ہوگئے ایک دفعہ میری ملاقات میرے ایک دوست سے ہوئی جو ہندوستان سے آیا ہوا تھا مجھے اس کی زبانی ماموں کا حال معلوم ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ چچا مجھے روپیہ بھیجتے بھیجتے تنگ آگئے تھے۔ کیونکہ ان کی آمدنی کم تھی۔ جو کچھ ان کی آمدنی تھی وہ مجھے بھجوا دیتے وہ خود تنگ دستی سے گزارہ کرتے۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی ان ہی دنوں ہیضہ پھیلا ہوا تھا ماموں جان کو بھی ہیضہ ہوگیا۔ اور وہ ۲ گھنٹے کے اندر ختم ہو گئے۔ ان کے مرنے سے مبین کو بہت رنج ہوا۔ اس نے مجھے اطلاع کرنا مناسب سمجھا۔ ان ہی دنوں اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے لڑکی نام تمکین رکھا۔ بڑی دقتوں سے وہ اپنی زندگی کے دن گزارتی تھی۔ آخر تنگ آکر وہ ایک گاؤں چلی گئی اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ جبین کی موت کی خبر سنکر مجھے بہت غم ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے اپنی

لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا وہ لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا میں ولایت سے اسقدر گھبرایا کہ ہندوستان جانے کی ٹھان لی۔ میری ملاقات لندن میں نشاط سے ہوئی میں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ وہ بھی آئی تھی۔ پہلی سی شریر و شوخ نہ تھی بلکہ سنجیدہ طبیعت تھی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس کے شوہر مسٹر مظفر ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس کے ایک بچی بھی تھی۔ بہت پیاری سی لڑکی تھی بالکل نشاط کی ہم شکل۔ میں نے بچی کو گود میں لیکر کہا "نشاط بچی کا نام کیا ہے؟"

"میں تو بے بی کہتی ہوں۔ لیکن اس کے پاپا کشور بولتے ہیں"

میں نے بچی کو بہت پیار کیا۔ نشاط سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ رضوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ کہتی تھی وہ ولایت سے جب نیویارک گئے بیمار رہنے لگے وہ میرے انکار سے بہت غمگین ہوئے۔ اور جب بیمار ہو گئے۔ اور ایک سال کے بعد انتقال ہو گیا میں لندن سے سیدھا بمبئی آیا۔ میرا دل دنیا سے بالکل گھبرا گیا تھا۔ اسی لئے یہاں سمندر کنارے گھر بنایا۔ اور اکثر سمندر کنارے دل بہلایا کرتا۔ ایک دفعہ میں سمندر کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ مجھے ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ یہ لڑکی تمکین تھی۔ مجھے اسے دیکھکر محبت سی ہو گئی۔ تمکین بالکل حسین کا مجسمہ تھی۔ اسی لئے میں اُسے محبت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور اسے دیکھنے روز سمندر کنارے جاتا۔ اور روز بروز میری محبت اس کے لئے بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ میں سمندر کنارے بیٹھا ماضی کے خیالات پر غور کر رہا تھا کہ مجھے کسی نے پکارا میں نے پلٹ کر دیکھا ایک بڑھیا کھڑی تھی۔ بڑھیا میرے پاس بیٹھ گئی اور بولی ڈاکٹر صاحب آپ کو تعجب ہو رہا ہو گا میں کس لئے آئی ہوں میں کوئی علاج کے لئے نہیں آئی۔ بلکہ ایک راز کا انکشاف کرنے آئی ہوں اب میرے مرنے کے دن قریب ہیں اس لئے یہ راز ظاہر کر رہی ہوں تمکین آپ کی بیٹی ہے جبتک میرے ہی پاس رہی تھی میں اسے بیٹی کی طرح پیار کرتی تھی۔ اس کی زبانی مجھے آپ کا سب حال معلوم

ہوا۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی تھی اگر آپ کبھی ولایت سے واپس آئیں۔ تو تمکین کو میں آپ کے حوالہ کردوں"۔

میں نے تڑپ کر کہا "لیکن تم نے ابھی تک کیوں نہیں بتایا میرے آنکھوں کے نور کو مجھ سے کیوں دور رکھا۔ میرا دل تڑپتا رہا۔ تم بڑی ظالم ہو۔ اتنے عرصہ تک مجھے تڑپتا دیکھنے میں مزہ آیا"۔

وہ رو کر بولی۔ "مجھے معاف کردو۔ میں تمکین کی محبت سے مجبور تھی۔ میں نے اسے بچپن سے پرورش کی ہے۔ اس لئے مجھے گوارہ نہ تھا"۔

بڑھیا چلی گئی۔ میں گھر چلا آیا۔ رات کو میں سمندر کنارے گیا۔ مجھے تمکین نظر آئی میں دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور تمام حال سنایا۔ وہ خوب روئی میں چلا آیا تھوڑی دیر بعد مجھے چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے جو سمندر کنارے جا کر دیکھا۔ تمکین بیہوش پڑی تھی۔ میری معصوم بچی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے زخمی کیا۔ آہ۔ اسے نہیں معلوم کہ مجھ ناشاد کو مدت کے بعد ایک خوشی نصیب ہوئی تھی۔ وہ بھی اس طرح چھن گئی میں زندہ ہوں لیکن میری روح مرچکی ہے"۔

اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ میری تمکین کا قاتل کون ہے۔ تو اس طرح بدلہ لوں کہ چرخِ ستمگر بھی تھرا جائے۔ میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہچکیاں لیکر رونے لگے۔ میرے بھی آنسو نکل آئے۔ میں گھر چلی گئی۔ تسلیم گھر پر نہ تھا۔ نوکروں سے معلوم ہوا کہ وہ دو دن ہوئے کہیں چلا گیا۔ اور نوکروں کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ تمکین کی میت میں شریک ہوا تھا۔ اور گھر آکر بہت رویا تھا۔ بھلا میں پھر میں کیوں نہ کہوں کہ تسلیم کو تمکین سے محبت ہے۔ تسلیم میرے نام ایک خط چھوڑ گیا تھا۔ خط میں تحریر تھا۔

"میری بہن!

میں جارہا ہوں۔ زندگی ہوگی تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔ میری زندگی کے

یہ ربط کے تار بکھر گئے ہیں۔ ترنم نکلنے کی کوئی امید نہیں۔ اسلئے میں فوج میں آگیا ہوں۔ شاید مجھے یہاں سکوں مل جائے۔"

تسلیم

مجھے خط پڑھکر بہت رنج ہوا۔ فوراً سفر کی تیاری شروع کردی۔ اور نواب صاحب کے پاس آگئی۔ ابا نے تسلیم کے بارے میں پوچھا تو میں نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کی کہ وہ فوج میں چلا گیا ہے۔"

ابا کو بہت رنج ہوا وہ بولے یہ تمام دولت تو تسلیم کی تھی پھر فوج میں وہ کیوں گیا۔ والد کو بہت صدمہ ہوا اور جب سے وہ بیمار رہتے ہیں۔ اسی طرح دو برس گزر گئے دو برس بعد تسلیم آیا۔ اب پہلے کی طرح زندہ دل تسلیم نہ تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی اور بہت خاموش طبیعت ہو گیا تھا۔ مجھ سے بہت کم باتیں کرتا۔ اور اکثر مجھ سے کترا تا تھا۔ ایک دفعہ وہ شاید اپنے کمرے میں بیٹھا رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنسو پوچھ لئے اور مسکرا کر کہنے لگا۔

"آؤ باجی! بیٹھ جاؤ"

"بیٹھ تو جاؤں گی۔ یہ تو بتاؤ تم اداس کیوں رہتے ہو"

وہ بناوٹی مسکراہٹ سے بولا "کتنا تو خوش ہوں۔ باجی!"

میں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "تسلیم تم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتی ہوں تم تمکین سے محبت کرتے ہو۔ اگر محبت کا دوسرا نام نفرت ہے۔ تو تم تمکین سے ضرور محبت کرتے ہو"

"باجی میرے سامنے اُس بیوفا کا نام نہ لو"

میں نے طعنے سے کہا تم ایک معصوم لڑکی کو بیوفا کہتے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی تم اصل واقعہ نہیں جانتے۔ پھر اس کے بعد میں نے تمام واقعہ سنایا۔ اس کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے۔ وہ فوراً آنسو پی کر بولا "کچھ بھی ہو۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں"۔

میں نے جب یہ الفاظ سُنے تو میں غصہ سے پاگل ہو نے لگی۔ اور ایک طمانچہ میں نے اس کے گال پر رسید کیا۔ طمانچہ کا نشان اس کے چہرے پر بن گیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا وہ بولا۔ تم نے خوب کیا باجی! اور ایک مار دو میں اسی قابل ہوں۔ میں کچھ نہ بولی دوسرے دن وہ چلا گیا۔ ابّا نے اور میں نے کتنا روکا لیکن وہ ٹھہرا نہیں جب سے ابھی تک نہیں آیا

مہتاب یہ کہکر خاموش ہو گئی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی "تمکین اگر محبت کے معنی نفرت ہیں تو تسلیم تمکین سے ضرور محبت کرتا ہے اور میرا دل بھی یہی کہہ رہا ہے"۔

مہتاب نے ایک چیخ لی اور بیہوش ہو گئی۔ تمام گھر کے لوگ جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اور میں چلی آئی۔ دوسرے دن مجھے معلوم ہوا مہتاب علاج کے لئے بمبئی چلی گئی ہے اُس دِن سے میری ملاقات مہتاب سے نہیں ہوئی۔ اب بھی مہتاب کی یاد میرے ذہن میں آجاتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت خوش اخلاق لڑکی تھی۔

مصوّر

آبادی سے بہت دور ایک کوٹھی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی شان و شوکت سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے مکین بھی بہت شاندار ہوں گے۔ اس کے برخلاف یہ کوٹھی بالکل ویران تھی صرف اس کا بالائی حصہ آباد تھا جس میں تاہر حسین مرحوم کا چشم و چراغ محسن اپنی زندگی کے دن گزارتا تھا۔ یہ اعلیٰ درجے کا مصوّر ہے اس کا کام سوائے تصویر کھینچنے کے کچھ نہ تھا۔ اس کے تصویر خانے میں اعلیٰ اعلیٰ تصویریں تھیں اس نے اس کام میں اپنی جوانی کھو ڈالی تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اس دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تصویر بناتے وقت کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک نمودار ہو جاتی۔ جیسے تاریکی میں روشنی پیدا ہو گئی ہو۔ اس کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ ایک کامیاب مصور بنے گا چاہے اسے اس کام میں اپنی عمر ہی کیوں نہ صرف کر دینی پڑے۔ وہ دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ ایک کامیاب مصور ضرور بنے گا وہ اپنے تصویر خانے میں ایسی تصویر بنانا چاہتا تھا جس کی نظیر دنیا میں نہ ملے وہ رات رات بھر اسی کام میں مشغول رہتا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس کا باپ حسین ہیضہ میں مر چکا تھا اس کے کوئی رشتہ دار نہ تھے۔ صرف ایک پھوپی تھی۔ وہ اور کسی گاؤں میں رہتی تھی۔ محسن کی بیوی تھی نہ بچے جس کی پریشانی اسے ہوتی۔ آگرہ میں تصویروں کی نمائش ہونے والی تھی جس کی تصویر سب سے بہتر ہوگی اس کے لئے پانچ ہزار روپے کا انعام تھا۔ اس نے بھی ارادہ کر لیا کہ وہ ایسی تصویر پیش کرے گا کہ دنیا دنگ رہ جائے۔ اسے نہ روپیہ اور نہ

شہرت کا لالچ تھا۔ وہ صرف دنیا کو اتنا بتا دینا چاہتا تھا کہ جسم خاکی بھی کچھ کر سکتا ہے جس میں وہ کوشش کرے۔ محسن نے دو مہینہ پہلے ہی سے تصویر کشی شروع کر دی جس نے وہ رات کی نیند بھی حرام کر دیتا۔ اس کو کھانے کی بھی مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ تھا اور اس کی تصویر۔ ہر وقت وہ میز کے سامنے بیٹھا تصویر کھینچا کرتا تھا۔ شام کا دھندلکا چھا چکا تھا۔ سیاہی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ کوٹھی پر ویرانی برس رہی تھی۔ محسن میز کے سامنے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گہری سوچ میں ہے۔ اس کی تمتماتی آنکھیں کبھی کبھی چمک اٹھتیں۔ اس کا زرد سو کھا ہوا ہاتھ ٹھوڑی سے لگا ہوا تھا۔ اس کا زرد چہرہ شمع کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ یکایک وہ خیال سے چونکا۔ کیونکہ کوئی دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے نحیف و ناتواں ہاتھوں نے بھاری بھرکم دروازہ کھولا۔ پوسٹ مین جو دروازہ میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چٹھی پکڑا دی۔ اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ شاید وہ محسن کی ہئیت دیکھ کر مسکرایا ہو۔ محسن نے لفافے پر نظر ڈالی۔ نیلے رنگ کا لفافہ تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔

"مصور ہند محسن۔ حسین منزل آگرہ"

اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ خداوند کس کا خط ہو سکتا ہے۔ آج تک میں نے کسی کو دوست بنایا نہ دشمن۔ پھر یہ خط کیسا ہے۔ اس نے خط کو نہایت لاپرواہی سے میز پر ڈال دیا۔ اور تصویر پر برش سے رنگ بھرنے لگا اس کی نگاہ پھر خط پر جا پڑی۔ شمع کی روشنی میں خط کے حروف چمک رہے تھے۔ اس نے خط کو جلا دینا چاہا۔ کیونکہ اس کی نظر بار بار خط پر پڑتی اور کام میں ہرج ہوتا۔ یکایک اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے سوچا اگر خط پڑھ لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا لفافے کے اندر ایک گلابی رنگ کا کاغذ تھا۔ اس نے شمع کی روشنی میں خط پڑھنا شروع کیا۔ خط نہایت خوبصورت حروف سے لکھا ہوا تھا۔

خط میں تحریر تھا۔
گلگٹ۔

ناہید منزل۔
ہند کے مصور میرے بھائی محسن۔

تسلیم و نیاز۔
تکلیف دینے کی وجہ یہ ہے کہ والدۂ محترمہ ۳۰ ر دسمبر کو چل بسیں۔ اور انکی وصیت کے مطابق میں ۲ ر جنوری کو آپ کے پاس آرہی ہوں۔

آپ کی پھوپی زاد بہن "فرخ"

اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے نفرت سے منہ بنایا۔ اور اخط کو مروڑ ڈالا۔ اسکا ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے بمشکل میز کا سہارا لیا۔ اور دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے سر تھام لیا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے آگئے اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ گلا خشک ہوگیا۔ اس نے بمشکل "پانی" کہا۔ ایک بوڑھے شخص نے جس کی ریش تک سفید تھی کانچ کے گلاس میں پانی لاکر میز پر رکھ دیا محسن نے اس بوڑھے کو کھانے پکانے کے لئے رکھا تھا اس کوٹھی میں صرف یہ دو جاندار رہتے تھے۔ بوڑھا بھی تنہائی پسند تھا اسکے بیوی بچے ہیضہ میں مرچکے تھے۔ آگرہ میں ہیضہ کی وبا پھیلی تھی۔ ہزاروں گھر تباہ ہوگئے تھے اسی ہیضہ میں تاج حسین کا بھی انتقال ہوا تھا۔ بوڑھے کو اپنے بیوی بچے مرنے کیوجہ سے بہت غم ہوا لیکن اسے ایک غم اور دیکھنا تھا۔ اس کا جوان بیٹا جو فوج میں تھا گولی لگ جانے کی وجہ سے مرگیا۔ لڑکے کے مرنے کیوجہ سے بوڑھے کو بہت صدمہ ہوا۔ اس کو دنیا سے نفرت ہوگئی ان دونوں آقا غلام کی خوب گزر ہوتی تھی کیونکہ یہ دونوں دنیا سے بیزار تنہائی پسند تھے محسن اس بڈھے کو بابا کہتا تھا۔ یہ بھی محسن کو اپنے بیٹے کیطرح چاہتا تھا۔ بابا نے محسن کے خشک بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیٹا محسن پانی

پی لو۔ کیا سوچ رہے ہو؟"
محسن نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ تھرتھرانے لگا۔ اور گلاس نیچے آرہا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ بابا نے گلاس کے ٹکڑے جمع کرتے ہوئے کہا:
"تم کو ہو کیا گیا ہے؟"
"بابا مجھے بچاؤ" یہ کہکر محسن بیہوش ہوگیا۔ بابا نے محسن کو سہارا دیکر پلنگ پر لٹایا اور پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد محسن کو ہوش آگیا۔
بابا نے محسن کی پیشانی سے قطرے پوچھتے ہوئے کہا۔
"بیٹا یہ کیا حالت ہے کچھ تو بولو"
محسن نے جواب میں فرخ کا خط بڑھا دیا۔ بابا نے محسن کے ہاتھ سے خط لے لیا اور شمع کی روشنی میں خط پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بار بار چمک اٹھتیں۔ اور چہرہ پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ جاتی۔ خط کے اختتام پر بابا نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔
"محسن کتنے پیارے الفاظ ہیں "ہند کے مصور" واقعی میں وہ تمھیں مصور سمجھتی ہے۔ اور بڑی خلیق معلوم ہوتی ہے۔ کون ہے فرخ"
وہ منہ بنا کر بولا "میری پھوپی کی لڑکی ہے۔ اور میری منگیتر۔ والد نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری شادی فرخ سے ہو۔ ابا کی وفات کے بعد پھوپی نے میری شادی فرخ سے کردی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھوپی نے کہا میرے مرنے کے بعد فرخ تیری بیوی ہوگی۔ ابھی چاہے انکار کر۔ سو وہ چل بسیں اور میرے سر پہ بلا منڈھ گئیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا میں اپنا عزیز وقت اسے نہیں دونگا۔ بابا پندرہ جنوری کو نمائش ہے۔ میں کیسے تصویر بنا سکوں گا۔ مجھے تنہائی کا وقت کیسے ملے گا"
بابا ہنسکر بولا "وہ تیرا وقت تو نہ لے گی"
وقت چاہے نہ لے لیکن مجھے فرخ سے نفرت ہے۔ فرخ ہی کیا مجھے دنیا کی تمام

لڑکیوں سے نفرت ہے۔ جوان کی دنیا میں جاتا ہے برباد ہو جاتا ہے۔ نہیں بولو میرے مستقبل کا کیا ہوگا۔ میں کیسے نامور مصور بن سکوں گا۔ میں خود کشی کر لوں گا۔ لیکن فرخ سے شادی نہیں کروں گا۔ محسن کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ بابا محسن کے رخساروں پر سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ کس قدر نازک تخیل ہے۔ سو رہا ہے۔ پاگل تو غلطی پر گامزن ہے۔ تیری مصوری ادھوری ہے۔ اور ادھوری ہی رہے گی جب تک تیری زندگی میں کوئی عورت شامل نہ ہو۔ عورت کی فطرت ہی مصوری ہے۔ پھر تو اس کے بغیر کیسے مصور بن سکتا ہے۔ تجھے عورتوں سے نفرت ہے تو تو نے خدا سے کہہ دیا۔ کہ تیری ماں بھی مر ہوتی۔ سچ کہنا بیٹا تجھ سے تیری ماں زیادہ محبت کرتی تھی یا تیرا باپ"

"بابا میں تو بچپن ہی سے شفقت مادری سے محروم ہوں"

بابا ہنس کر کہنے لگا "بھئی تو تجھے عورت کے بارے میں علم نہیں ہے۔ تو محبت کے لفظ سے ہی آشنا نہیں۔ تو جانتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ عورت سراپا محبت کا مجسمہ ہوتی ہے"

"تم مجھے دھوکا دے رہے ہو بابا میرے مستقبل کو بگاڑ رہے ہو"

"بیٹا میں نے کب تیری برائی چاہی جو آج برا چاہوں گا۔ آج یکم جنوری ہے کل میں فرخ کو لینے اسٹیشن جاؤں گا"

محسن نے بابا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑوں کو دیکھ کر سر تھام لیا۔ گویا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے مستقبل کا بھی جام یونہی چکنا چور ہونے والا ہے۔ دوسرے دن بابا صبح ہی صبح تیار ہو گیا۔ آج اسے اسٹیشن جانا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ آج اس نے کھانے میں مرغ پلاؤ تیار کیا تھا اور گھر کو خوب صاف کر لیا تھا۔ اور ایک کمرے کو فرخ کے واسطے مخصوص کر دیا تھا۔ اس نے اس کمرہ کو خوب سجایا اور ایک بڑی محسن کی فوٹو لگا دی۔ وہ اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ جاتے

ہوئے بولا محسن بیٹا وہ کالی شیروانی ضرور پہن لینا۔ اور ذرا اپنے بکھرے ہوئے بال کو بھی سنوار لینا۔ ورنہ وہ کیا کہے گی؟"

محسن شیروانی کو پٹکتے ہوئے بولا "تم اسٹیشن سدھارو۔ میں خوب سنور لوں گا۔ کیونکہ آج میرا جنازہ نکلے گا نہ؟"

بابا منھ پر انگلی رکھکر بولا "چپ یہ الفاظ کیوں منھ سے نکالتا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ ایک دن تیرا جنازہ نہیں بلکہ تو گھوڑے پر دولھا بن کر نکلے گا؟"

بابا کی طرف محسن نے گھورتے ہوئے کہا "آپ جائیں گے یا نہیں؟ کلیجہ جلانے کو اور کچھ باقی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آج ملکہ صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔ آج ان کے اعزاز میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے؟"

بابا ہنستا ہوا چل دیا۔ اسٹیشن پر آ کر دیکھا گاڑی آچکی تھی۔ مسافر اتر رہے تھے ایک دبلی پتلی لڑکی کمپارٹمنٹ سے اتری اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں بستر تھا وہ تانگہ تلاش کرنے لگی اور ایک تانگہ کے پاس آکر بولی "تم مجھے حسین منزل لے جا سکتے ہو؟"

بابا جو تانگہ کے پاس کھڑا تھا حسین منزل کا نام سنکر چونک گیا۔ وہ لڑکی کیطرف غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کس قدر حسین یہ لڑکی ہے۔ محسن بھی کیا دیوانہ ہے ایک حسین لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ شاید کبھی اپنی شکل آئینے میں نہیں دیکھی ہے۔ لڑکی نے جب بابا کو اپنے منھ کیطرف غور سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو گھبرا کر کہنے لگی۔

بڑے میاں! میرے چہرہ میں تو کچھ لگا نہیں ہے؟"

بابا مسکرا کر "نہیں تو میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی حسین ہو؟"

لڑکی کی شرما کر سر جھکا لیا۔ بابا نے پھر کہا۔ فرخ بیٹی۔ لڑکی نے بوڑھے کے

منہ سے جب اپنا نام سُنا تو چونک پڑی اور پوچھا۔
آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا
"وہم اور اپنی بیٹی کا نام نہ جانے۔ چلو بیٹی محسن انتظار کر رہا ہوگا۔"
لڑکی نے چہرہ پر سرخی کی لہر دوڑ گئی وہ بولی "وہ بولی بابا کیا واقعی میں وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مصوروں کو تو تصویروں کا انتظار ہوتا ہے۔"
دونوں تانگہ پر بیٹھ گئے۔ تانگہ چل دیا۔ لوگوں نے دیکھا تانگہ بستی سے دور جا رہا تھا حسین منزل کے پاس جا کر تانگہ رک گیا۔ فرخ نے تانگہ والے کو پیسہ دیکر بابا سے کہا "مجھے کہاں چلنا ہوگا؟"
بوڑھے نے بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کمرہ میں شمع جھلملا رہی تھی
فرخ نے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کہا۔ "بابا وہ کیا کر رہے ہوں گے؟"
"تصویر اتار رہے ہوں گے۔"
"اتنے وقت۔" فرخ نے تعجب سے کہا۔
"ہاں" بابا سادگی سے بولا۔ اب وہ دونوں سیڑھیاں طے کر چکے تھے۔ اور کمرہ میں پہنچ کر فرخ نے دیکھا کمرہ میں ایک مدھم شمع ٹمٹما رہی تھی۔ در و دیوار پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ کمرہ میں چند المار یاں تھیں ایک میز بچھی ہوئی تھی جس پر جگہ جگہ رنگ گرا ہوا تھا پاس ہی اسٹول پر ایک شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ فرخ اسے آسانی سے نہ پہچان سکی کیونکہ اس شخص کی پشت نظر آ رہی تھی یہ شخص نہایت ناتواں معلوم ہو رہا تھا بال سنوارے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ کالے رنگ کی شیروانی نہایت بے ڈھنگے پن سے پہن رکھی تھی۔ اس کی کانٹے کی طرح سوکھی انگلی ٹیڑی پھرتی سے کام کر رہی تھی۔ فرخ نے تعجب سے بابا کی طرف دیکھ کر کہا "ہمارے مصور نے اس خبطی کو بھی نوکر رکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مصور کو خبطیوں سے بہت دلچسپی ہے۔"

بابا نے کچھ نہیں کہا اور دوسرے کمرہ میں چلنے کے لئے اشارہ کیا۔ دوسرے کمرہ میں پہنچ کر بابا نے کہا" بیٹیا! ہمارے مصور تو تمہارے بنے ہیں"
"پھر وہ کون تھا" فرخ نے سوال کیا۔
"ہمارے مصور"۔ بابا سادگی سے بولا۔
"کون۔ محسن" فرخ حیرت سے بولی۔
"ہاں" بابا نے کہا۔ فرخ کے اوپر جیسے بجلی گر گئی ہو۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی اس کے چہرہ کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا تھوڑی دیر بعد فرخ نے کہا" مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ محسن ہیں۔ محسن تو ایک تندرست اور خوش مزاج نوجوان ہیں۔ کیا مصوری کے یہی معنی ہیں کہ وہ انسان کو انسان نہ رکھے۔ تو ایسی مصوری پر ہزار لعنت ہے" فرخ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔
خاموش ہو بیٹی۔ اتنا غصہ اچھا نہیں بابا پنکھا جھلنے لگا۔ فرخ خاموش تھی اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بہت گہری سوچ میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ساری کا آنچل سر پر ڈال کر بولی" محسن مجھ سے اسوقت مل سکتے ہیں"
کیوں نہیں! میں ابھی جا کر خبر کئے دیتا ہوں۔ انھیں تمہارے آنے کی خبر نہیں ورنہ وہ تم سے ملنے ضرور آتے" بابا چلا گیا محسن کے کمرہ میں آیا محسن آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی بابا نے جھک کر دیکھا شیشی پر زہر قاتل لکھا ہوا تھا بابا نے پھرتی سے شیشی محسن کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور زمین پر پٹک دی شیشی کے ٹوٹنے کی آواز سے محسن چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں انگارے کیطرح سرخ تھیں۔ وہ چیخ کر بولا" بابا تم نے یہ کیا کیا۔ میری زندگی چھین لی"
پاگل زہر پینے سے زندگی ملتی ہے۔ کتنے بزدل ہو تم۔ ایک عورت کے خیال سے

زہر پی رہے ہو۔ دنیا کیا کہے گی کہ مصور محسن نے ایک لڑکی کے ڈر سے زہر پی لیا دنیا قہقہہ لگائے گی۔ لوگ تالیاں بجائیں گے میں کبھی برداشت نہ کر سکوں گا۔ فرخ سے تم گھبراتے کیوں ہو وہ ایک ہمدرد لڑکی ہے۔ تم اس سے ملو وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے"

یہ کہکر بوڑھا کمرے سے باہر نکل گیا محسن کے کان میں بار بار بابا کی یہی بات سنائی دے رہی تھی۔ کہ فرخ ایک ہمدرد لڑکی ہے" وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اپنے رنگین ہاتھ دھوئے پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ شیروانی کا بٹن لگایا۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے پیروں سے کمرہ کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کی طرف پہنچا۔ تو اسے فرخ کے گانے کی آواز آئی محسن نے لوٹنا چاہا۔ کیونکہ اسے موسیقی سے سخت چڑ تھی۔ فرخ نے آہٹ سن لی تھی۔ وہ دروازے کے پاس آئی۔ اور بولی آئیے۔ تشریف لائیے۔ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے تو بڑی خوشی ہے کہ آپ ایک مصور ہیں"

محسن نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ فرخ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا فرخ نے جب محسن کو اپنے چہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو تمسخرانہ انداز میں بولی "مصور کیا میری تصویر بھی اتارنے کی فکر ہے۔ لیکن میری تصویر کامیاب نہ ہوگی"

محسن نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ فرخ غصہ سے بولی " آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں میرا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں۔ کیا مجھ سے بات کرنے سے آپ کا حرج ہوتا ہے۔ کیا آپ کے ہوش کے ساتھ عقل بھی غائب ہو گئی ہے"

محسن چکرا کر گرنے والا تھا۔ وہ اتنی سخت کلامی کی تاب نہ لا سکا۔ اور چکرا کر گرنے والا ہی تھا۔ کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے سنبھال لیا۔ یہ بابا کے ہاتھ تھے۔ بابا نے محسن کو سہارا دیتے ہوئے کہا "بیٹی تم اتنی سخت کلامی کیوں کر رہی ہو۔ ہمارے مصور کبھی یہ برداشت نہ کر سکیں گے محسن کے ہوش و عقل سب کچھ ہے" بابا آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا گلا بھر آیا۔ اور وہ چلا گیا۔ اسی طرح پانچ چھ دن گزر گئے محسن فرخ سے علیحدہ علیحدہ رہتا تھا

اگر وہ کبھی اس کے کمرے میں چلی جاتی تو یہ کہکر ٹال دیتا "فرخ اسوقت مجھکو ضروری کام ہے مہربانی کرکے چلی جاؤ۔ کھانا بھی وہ فرخ کے ساتھ بہت کم کھاتا۔ اگر وہ کھانے کے درمیان باتیں کرنا چاہتی تو محسن یہ کہتا" فرخ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کھانے کے درمیان باتیں نہیں کرنی چاہئیں"

فرخ جل کر بولی" تو پھر میں کب آپ سے باتیں کروں۔ جب دیکھو آپ کو فرصت ہی نہیں"

محسن عاجزی سے بولا" پندرہ جنوری کے بعد میں اپنا تمام وقت تمہارے لئے صرف کردوں گا۔ فرخ خاموش ہوگئی۔ رات کا وقت تھا۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے قمر چہاردہم آسمان پر جلوہ گر تھا۔ کوٹھی کے سامنے کے حصے میں باغ کی ایک شکستہ روش کے پاس فرخ بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی چمن میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ ایک پھول نظر نہ آتا تھا گلاب کی جھاڑی میں صرف ایک پھول کھلا ہوا تھا۔ فرخ اسے دیکھ کر توڑنے کے لئے بڑھی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس کا دوپٹہ جھاڑی میں الجھ گیا۔ اس نے فوراً چھڑا لیا۔ اور پھول کو توڑ کر اپنے بالوں میں لگالیا۔ اسے ایک آہ سنائی دی۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ دو آنکھیں اس کی طرف تکتی ہوئی نظر آئیں۔ اور ایک ڈھانچہ سا بالائی منزل کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ فرخ نے فوراً پہچان لیا کہ محسن ہے۔ فرخ کو محسن سے ہمدردی تھی وہ اسکی بے کیف زندگی کو رنگین بنانا چاہتی تھی۔ لیکن محسن اس سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ اور وہ تنہائی پسند تھا۔ اس لئے فرخ اس کی تنہائی میں حایل نہیں ہوتی تھی۔ اس نے جو اسکی آہ سنی تو بہت متاثر ہوئی وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کا دل نہ لگا۔ اٹھی اور محسن کے کمرہ کی طرف گئی۔ محسن کے کمرہ کی طرف اندھیرا سا نظر آیا۔ فرخ کو تعجب ہوا کہ اتنی جلد محسن سوگیا۔ کیونکہ وہ رات رات بھر تصویر کھینچنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے کمرہ میں جھانک کر دیکھا تو اندھیرا نظر آیا۔ اس دروازہ پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا

اس نے دروازہ کو دھکا دیا وہ فوراً کھل گیا۔ اس نے شمع روشن کی تو دیکھا کہ محسن کا پلنگ خالی تھا۔ اس نے سوچا اتنی رات گئے کہاں جا سکتے ہیں۔ پھر خیال ہوا کہ شاید بابا کے پاس بیٹھے ہوں وہ میز کیطرف بڑھی۔ میز پر ایک تصویر رکھی ہوئی تھی جس پر جگہ جگہ رنگ گرا دیا گیا تھا۔ اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو وہ تصویر ایک نازک اندام حسینہ کی نظر آئی۔ جو بالکل فرخ جیسی تھی۔ تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ حسینہ کا ہاتھ پھول کیطرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ کانٹے سے دامن چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

فرخ نے سوچا یہ تو آج ہی کا نظارہ ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

"جس طرح یہ حسینہ اپنا دامن کانٹے سے چھڑا رہی ہے۔ اور پھول کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دنیا کی تمام صنفِ نازک یہی چاہتی ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتیں کہ گلاب چند دن میں مرجھا جائے گا۔ لیکن یہ جھاڑی ہمیشہ خوشبو سے معطر رہے گی۔"

فرخ کو آج محسن کے کیریکٹر کا اندازہ ہوا۔ اس نے سوچا کتنے بلند خیالات ہیں محسن کے۔ شاید وہ مجھکو بھی ایسا سمجھتے ہیں۔ اس نے تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہا تصویر کی پشت پر تحریر تھا۔

"فرخ"

"میں تمہارے راستے کا کانٹا بننا نہیں چاہتا۔ آجکل مجھکو کچھ ہمدردی ہو گئی تھی لیکن غلطی پر تھا۔ آج میں نے چاند کی روشنی میں وہی نظارہ دیکھا جو میں نمائش میں پیش کرنیوالا تھا۔ میرا تو صرف خیال ہی تھا کہ نازنین کانٹے سے دامن چھڑا رہی ہے لیکن تم نے سچ کر دکھایا۔ واقعی میں تمہاری آنکھوں میں مثل خار کے کھٹکتا ہوں۔ اس لئے میں تمہارا راستہ صاف کئے جا رہا ہوں۔ تم اپنی خوشی سے شادی کر سکتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نمائش میں تصویر پیش نہ کر سکا۔ میں جا رہا ہوں ایک نامعلوم دنیا میں جہاں مجھے کوئی نہ پہچانے گا۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔"

تمہارا مصور محسن "

فرخ سناٹے میں آگئی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ محسن کو واپس لائیگی اتنی رات گئے وہ کہاں جا سکتا ہے۔ ضرور وہ اپنے دوست کے یہاں گیا ہوگا۔ وہ دوڑی ہوئی باورچی خانے میں پہنچی۔ بابا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

"بابا تم محسن کے دوست کا گھر جانتے ہو" فرخ جلدی سے بولی۔

بابا نے اطمینان سے کہا "محسن کے دوستوں سے تجھے کیا گلہ ہے"

"خدا کے واسطے جلدی بولو۔ میری تو جان نکلی جا رہی ہے"

"آخر معاملہ کیا ہے" بابا گھبرا کر بولا۔

"کیا کہوں [illegible] بابا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے"

"کون [illegible] مصور"

"ہاں" فرخ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بابا گھبرا کر بولا "خدا کے واسطے جلدی بولو یہ معاملہ کیا ہے" بابا کے جواب میں فرخ نے وہ تصویر پیش کر دی۔ بابا اس کی تحریر پڑھکر بولا "تم محسن [illegible] دوست کو کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"میں [illegible] لیئے پوچھ رہی تھی کہ وہ ضرور اسوقت اپنے دوست کے گھر گئے ہونگے"

[illegible] کہ [illegible] بابا [illegible] کبھی ہوگا۔ جانے والا جا چکا۔ اگر اُسے واپس بھی بلایا جائے [illegible] وہ [illegible] آئے گا۔ اس کا ارادہ اٹل ہے۔ اگر اسکو اپنی مصوری اور تصویر [illegible] تو وہ ضرور کبھی نہ کبھی آئے گا میرا دل کہتا ہے کہ ضرور لوٹ کر آئیگا کیونکہ اس [illegible] دیر جانے کی اس کی مصوری کی محبت اسے ضرور واپس لائے گی اگر تم اسے [illegible] ڈھونڈنے بھی نکلیں تو وہ واپس نہ آئے گا۔ تو اس کا انتظار کرو"

"بابا [illegible] ٹھیک ہے۔ ان کا غلط خیال ہے کہ میں انکو اتنا ذلیل نہیں سمجھتی جتنا وہ سمجھتے [illegible] میں تو ان کو مصور سمجھتی ہوں" فرخ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی

بابا شرارت سے بولا "تم اس کو صرف معمولی سی ہمدردی سمجھتی ہو کر اور کچھ۔ اپنے دل کے کسی کونے میں دیکھو۔ وہ تمہارے دل میں کچھ اور رتبہ رکھتا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب" فرخ نے چیں بجبیں ہو کر بولا۔

تم سمجھوگی کیوں۔ نادان بچی ہو۔ سچ بتا محسن کے دل میں تمہارے لئے کچھ محبت ہے" بابا فرخ کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ گویا وہ اس کی آنکھوں کے ذریعہ دل کا حال پڑھنا چاہتا ہے۔

فرخ نے دوپٹہ کا ایک کونہ مروڑتے ہوئے کہا "محبت تو نہیں۔ ہاں البتہ ہمدردی ہے"

اس کی محبت کا صلہ یہی ہے کہ تم صرف ہمدردی سے ٹال رہی ہو"

کیا کہا آپ نے "محسن مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ فرخ نے تعجب سے کہا۔

کیوں نہیں وہ محبت کرتا ہے۔ تمہاری والدہ نے تو تمہاری شادی [illegible] طے کی ہے۔ پھر وہ تم سے کیوں نہ محبت کرے گا"

"ہوں" فرخ نے کہا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک نامعلوم [illegible] دوڑ گئی۔ دوسرے دن یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ محسن مصور [illegible] اسی دن پندرہ تصویریں تھی نمائش کا دن تھا۔ لوگوں کو حیرت تھی [illegible] غائب ہو گیا۔ کوئی کہتا تھا کوئی اچھی تصویر نمائش کیلئے نہ بنا سکا ہرگز [illegible] اٹھانے کے بجائے روپوش ہو گیا۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ فرخ کی وجہ سے [illegible] لوگوں نے فرخ کے خلاف خوب جی کھول کر کچھ دیئے جس سے بیچاری غمگین فرخ اور غمگین ہو گئی اب اس کا کام تھا وہ رو یا کرتی تھی۔ بابا اسے موقعہ دیکھکر سمجھایا تھا۔ اب وہ دن بھر تصویر خانہ کی سیر کیا کرتی اور کچھ تصویریں بھی کھینچنے لگی تھی ایک دفعہ وہ تصویر خانے کی سیر کر رہی تھی کہ اسے ایک الماری میں خوشرنگ ڈبہ نظر آیا ڈبہ بہت خوشنما تھا۔ ڈبے کے اوپر

گلابی مخمل منڈھی ہوئی تھی اور سنہری حروف سے لکھا ہوا تھا "مصوّر کی آخری منزل" فرخ نے ڈبہ کھول کر دیکھنا چاہا۔ تاکہ دیکھے مصور کی آخری منزل کیا ہے لیکن کچھ خیال آجانے کی وجہ سے ڈبہ کو رکھدیا۔ اور کمرہ میں آگئی۔ بابا محسن کی تصویر پر پھولوں کا ہار چڑھا رہا تھا۔ فرخ کو دیکھ کر بولا "کہاں گئیں تھیں بیٹی"

"تصویر خانے کی سیر کر رہی تھی"

"آج شاید محسن کو گئے ایک سال ہوگیا ہے" بابا تصویر پر کی گرد صاف کرتے ہوئے بولا۔ فرخ تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے کہا "بیٹی! مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آج محسن ضرور آئے گا"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا" خیالات سے چونک کر بولی۔

"یونہی میرا خیال ہے" بابا نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولا "فرخ تمھارے بخار کا کیا حال ہے۔ تم نے دوا بھی لی محسن آئے گا تو کیا کہے گا۔ کہ میرے جانے کے بعد تم نے فرخ کا خیال بھی نہ رکھا۔ کتنی دبلی ہوگئی ہو تم"

دوا سے تو مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ موت بھی نہیں آتی کہ مرجاؤں۔ اس کوفت سے چھٹکارہ مل جائے" فرخ بے دھیانی سے میز پر انگلیاں نچاتی ہوئی بولی۔ بابا نے غصہ سے کہا "موت کا نام نہ لیا کرو" اور پھر کام میں مصروف ہوگیا۔ اسی رات فرخ کوٹھی کے باغیچہ میں ایک شکستہ روش پر بیٹھی تھی۔ دسمبر کے جاڑوں کی راتیں خنک ہوائیں آرہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کلیجے پر تیر چلا رہے تھے۔ فرخ کے جسم پر کھورا کمبل لپٹا ہوا تھا۔ چاندنی کی روشنی میں وہ صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے لانبے گھونگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ نسیم اس بالوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی وہ چاندنی کی تصویر اتارنے میں ہمہ تن مصروف تھی۔ اسی وقت بالائی منزل کا دروازہ کھلا۔ اور ایک بوڑھا شخص کمبل لپیٹے نیچے اترا۔ یہ بوڑھا بابا تھا۔ فرخ نے

پہچان کر کہا" بابا ذرا ادھر تو آؤ۔ میں چاند کی تصویر اتار رہی ہوں۔"
بوڑھا نزدیک آ کر بولا" تصویر پھر دیکھ لوں گا۔ پہلے دوا پی لو۔ بخار اترا بھی نہیں اور تم پھر ہوا میں آ کر بیٹھ گئیں۔"
"مجھے بخار کی پرواہ نہیں۔" فرخ منہ بنا کر بولی۔
چلو اندر چلو بیٹی سردی لگ کر اور بخار ہو جائے گا۔"
فرخ بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی" بابا میں تو چاند کی تصویر اتار رہی ہوں۔ اندر سے وہ نظر نہ آئے گا۔"
"واہ ری پگلی۔ چاند جیسی چیز نظر نہ آئے گی۔ وہ تو سات پردہ میں سے بھی نظر آتی ہے۔"
"لیکن ذرا کم۔ فرخ نے آنکھ نچا کر کہا۔"
بابا ایک حاضر جواب تھا فوراً بولا" تمہاری آنکھ سے کم نظر آتا ہے۔ ہم بوڑھوں کی آنکھ سے نہیں۔"
فرخ نے بے دھیانی سے کہا۔ بابا سچ بتانا تم نے کبھی اتنا پیارا چاند دیکھا تھا؟"
بابا طعنہ سے بولا" اوں ہوں۔ ارے پگلی اپنا محسن بھی کوئی چاند سے کم تھا۔"
جی ہاں! اپنا لکچر بند کر دیجئے۔ اور ذرا یہاں سے تشریف لیجائیے وہ بابا کو ڈھکیلتے ہوئے بولی۔ بابا نے جاتے ہوئے کہا" اچھا جاتا ہوں۔" اور وہ چلا گیا۔
فرخ نے اطمینان کا سانس لیا وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اسکو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اس کے پاس کھڑا ہو۔ اور اس کی گرم سانس اس کے چہرہ کو چھو رہی ہے۔ فرخ نے مڑ کر دیکھا محسن نظر آیا۔ وہی شکل وہی چال ڈھال فرخ نے پہلے خیال کیا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ پھر وہ چلائی "محسن"
اسی وقت وہ وہاں سے غائب ہو گیا۔ وہ دوڑی ہوئی اوپر آئی۔ بابا سے لپٹ کر

بولی "بابا محسن آئے ہیں"

"کیا کہہ رہی ہے تو پاگل تو نہیں ہو گئی" بابا فرخ کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں وہ مجھے دکھائی دیئے ہیں"

بابا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ جب خوب دل بھر کر ہنس چکا تو بولا "پگلی تو نے خواب دیکھا ہے۔ ہر وقت محسن کا خیال رکھتی ہے۔ وہ نظر آ گیا ہو گا"

فرخ نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے دن آگرہ میں نمائش تھی۔ بابا نمائش میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ فرخ بال سنوارتے ہوئے بولی

"بابا کہاں جانے کی تیاری کر رہے ہو"

"نمائش میں جا رہا ہوں۔ آج آگرہ کی نمائش ہے۔ میرا خیال ہے کہ محسن ضرور اپنی تصویر نمائش میں پیش کرے گا۔ اسی لئے میں جا رہا ہوں"

"مجھے بھی لیجائیے نہ۔ میں بھی چلوں گی" فرخ منت سے بولی۔

"نہیں میں تم کو نہیں لے جاؤں گا۔ تم وہاں جا کر کسی کو بھی محسن بنا دو گی۔" بابا نے تیوری پر بل ڈالکر کہا۔ فرخ غصہ سے پیر پٹخ کر بولی "نہ لیجاؤ۔ میں زہر کھالوں گی"

بابا ڈر کر بولا "ارے پگلی چل۔ اگر کبھی زہر کھا لے گی تو میں محسن کو کیا جواب دونگا"

فرخ خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ بابا نے بگھی منگوا لی اور دونوں بیٹھ کر نمائش گاہ کی طرف چل دیئے۔ نمائش گاہ میں بہت بھیڑ تھی۔ تل رکھنے کو جگہ بھی نہ تھی۔ بڑی دقتوں سے فرخ اور بابا وہاں پہنچ گئے جہاں تصویریں رکھی تھیں۔ فرخ ہر ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کسی تصویر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک معصوم بچے کو فرشتہ اڑائے لئے جا رہا ہے۔ اور ماں ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "فرشتہ اجل" فرخ نے ایک اور تصویر دیکھی۔ یہ تصویر ایک حسینہ کی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ غزالی آنکھیں شراب کے چھلکتے پیالے معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام حسن ہونے کے باوجود اس کے

چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "دوشیزۂ غم" غرض بہت سی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر دیکھکر فرخ رک گئی۔ تصویر کے اوپر کھلے حرفوں سے لکھا تھا کوشش ناکام" یہ تصویر ایک حسینہ کی تھی جو ایک درخت سے ٹکی ہوئی بیٹھی تھی جسم پر بھدا کمبل لپٹا ہوا تھا یہ چاند کی تصویر اتار رہی تھی۔ حسینہ کی شکل بالکل فرخ جیسی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

یہ حسینہ چاند کی تصویر کھینچ رہی ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں کہ یہ کوشش اسکی ناکام ہے۔ یہ چاند کی تصویر نہیں اتار سکی۔ کاش یہ چکور کی تصویر اتارتی جو کہ چاند کے فراق میں آنسو بہایا کرتا ہے

"محسن"

فرخ نے سر تھام لیا۔ یہ تو اسی کی تصویر ہے۔ فرخ نے سوچا۔ اس نے بابا کو وہ تصویر دکھائی۔ بابا سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا "میں نہ کہتا تھا بیٹی! محسن ضرور تصویر دیگا میرا خیال ہے کہ محسن کی تصویر ضرور مقبول ہوگی۔ تھوڑی دیر میں محسن کی تصویر کا شور ہونے لگا سب نے محسن کی تصویر کی تعریف کی۔ چاروں طرف سے "واہ واہ" کی صدائیں آنے لگیں۔ سب نے محسن کو مصور تسلیم کر لیا۔ بابا اور فرخ خوش خوش گھر واپس آئے کپڑے بدلتے وقت یکایک فرخ کو خوش رنگ ڈبے کا خیال آگیا جس کے اوپر "مصور کی آخری منزل" لکھا ہوا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ آج محسن کو تمام دنیا نے مصور مان لیا ہے جا کر دیکھوں تو مصور کی آخری منزل کیا ہے وہ دوڑی دوڑی تصویر خانہ میں گئی اور الماری سے ڈبہ نکال لیا اور کھول کر دیکھا۔ اسکے حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ڈبہ کے اندر ایک چھوٹی سی شیشی رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر "زہر" لکھا ہوا تھا۔ فرخ کانپ گئی۔ مصور کی آخری منزل موت نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مریں گے نہیں۔ انھیں عزت و شہرت کی ضرورت ہے اتنا سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد انھیں موت چاہیئے۔ یہ کبھی

نہیں ہو سکتا۔ میں انھیں نہیں مرنے دوں گی۔ آج محسن کو سب نے مصوّر مان لیا ہے وہ ضرور شیشی لینے آئیں گے لیکن ایسا نہ ہوگا۔ میں اس کے بدلے خود قربان ہو جاؤں گی۔ وہ چیخ پڑی اور شیشی منہ میں انڈیل لی۔ زہر کا حلق میں پہنچنا تھا کہ اسکے ہاتھ پیر اینٹھنے لگے۔ آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ مردہ ہو کر گر پڑی۔ بابا اپنے کمرہ میں بیٹھا ترکاری کاٹ رہا تھا۔ اس نے جو فرخ کی چیخ سنی تو دوڑا ہوا تصویر خانے کی طرف گیا۔ اور فرخ کو مُردہ دیکھ کر وہ کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ اس پر سکتہ کا عالم چھا گیا وہ محوِ حیرت بن گیا اسکو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں وہ فرخ کے نزدیک گیا۔ اس کے جسم کو جھنجھوڑا جسم بے حس تھا۔ بابا کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ اسی وقت دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک ڈھانچہ داخل ہوا۔ بابا بولا "محسن تم آگئے۔ لیکن اب آنے سے کیا فائدہ جب فرخ تمھارا انتظار کر کے چل بسی۔ اب اس کی موت پر آنسو بہانے آئے ہو" بابا کی آواز بھر آگئی۔ وہ زار وقطار رونے لگا۔

تم کیا کہہ رہے ہو بابا۔ کیا فرخ مر گئی محسن چیخ کر بولا اور فرخ کے پاس گیا جس کا مُردہ جسم میز پر پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی ڈبہ کھلا ہوا پڑا تھا۔ اور شیشی خالی محسن کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ میں اس کا قاتل ہوں میں نے اسے مارا ہے۔ اس کی سزا مجھے ضرور ملنی چاہیے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ فرخ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے مجھے دھوکہ میں رکھا گیا" وہ تھوڑی دیر تک چیختا رہا پھر خاموش ہو گیا۔ اور ایسا خاموش ہوا کہ بابا کے ہزار دفعہ بولنے کے بعد بھی اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ بابا کو تو ایک صدمہ تھا ہی دوسرا یہ صدمہ بھی ہو گیا۔ اس نے محسن کو کتنا جھنجھوڑا لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔

بابا نے آخر کار مجبور ہو کر فرخ کے کفن دفن کا سامان کیا۔ جس وقت فرخ کا جنازہ جانے لگا بابا محسن کے پاس آیا اور اس کے شانے ہلا کر بولا۔

محسن خدا کے واسطے کچھ تو بولو۔ اتنے خاموش کیوں ہو۔ دیکھو فرخ کا جنازہ

جار ہا ہے۔ تم جنازہ میں شریک نہ ہو گے"
"نہیں" محسن کے آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔
"لیکن اس نے تمہارا کیا قصور کیا ہے۔ زندگی بھر جلاتے رہے۔ اب موت کے بعد بھی اسے چین سے نہ سونے دو گے۔ اگر تم اس کے جنازہ میں شریک نہ ہو گے تو اُسکی روح تڑپے گی" بابا تڑپ کر بولا۔
نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔ اگر میں اس کے جنازہ میں شریک ہوں گا تو اس کی روح ناراض ہو جائے گی وہ مجھ سے ناراض تھی۔ میں اسے اور رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھ پر سے قربان ہو گئی۔ لیکن میں بھی ساتھ ہی ساتھ مر گیا ہوں۔ دیکھنے کو تو زندہ ہوں لیکن میرے جذبات مر چکے ہیں۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے دنیا کی کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔ ہٹ جاؤ۔ وہ گرجنے لگا۔ بابا وہاں سے ہٹ گیا۔ شام کو جب کہ سیاہی پھیل رہی تھی ہر طرف سکوت کا عالم تھا فرخ کا جنازہ جا رہا تھا دنیا کا ذرہ ذرہ نوحہ خواں تھا۔ فضا پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ غم سے لوگوں کا دل چرا جاتا تھا۔ بابا تو غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ جنازہ کا ڈھنے کے بعد بابا واپس آیا۔ محسن کمرہ میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے بابا محسن کے نزدیک بیٹھ کر بولا "کیا سوچ رہے ہو محسن"
"یہی کہ میں کیا کروں" محسن لاپرواہی سے بولا۔
کرو گے کیا۔ قہقہہ لگاؤ۔ تمہارے دل میں تو خوشیوں کا طوفان امنڈ رہا ہے ہنسو! خاموش کیوں ہو۔ اس کے قاتل تم ہو تم" بابا دیوانہ سا ہو کر بولا۔
میں کب انکار کر رہا ہوں۔ میں تو خود اقبال کر رہا ہوں کہ میں اس کا قاتل ہوں تم میرے زخموں پر نمک کیوں چھڑک رہے ہو۔ کاش میں اپنا سینہ چیر کر بتا سکتا کہ مجھے کتنا غم ہے۔ تم کیا جانو میرے دل پر کیا بن رہی ہے۔ تم مجھے ہنسنے کو کہتے ہو تو میں

ہنسوں گا۔ اپنی بربادی پر قہقہہ لگاؤں گا۔"

محسن دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔ بابا نے کتنی سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود وُہ برابر ہنستا رہا۔ نہ جانے کب خاموش ہوا۔ دوسرے دن بابا اٹھا اور سیدھا محسن کے کمرہ میں گیا۔ محسن میز پر سر جھکائے لیٹا ہوا تھا۔ بابا نے محسن کو جھنجوڑا لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ محسن کے ہاتھ پیر ٹھنڈے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ کاغذ پر تحریر تھا۔

فرخ کو میں خوش نہ کرسکا۔ اس لئے میں اپنے جگر کے خون سے یہ لکھ رہا ہوں کہ میں فرخ سے محبت کرتا ہوں امید ہے کہ وہ مجھے معاف کردے گی۔

"محسن"

یہ حروف خون سے لکھے ہوئے تھے۔ بابا نے دیکھا محسن کی قمیض کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور سینہ میں ایک گہرا زخم تھا۔ بابا سر تھام کر رہ گیا۔ اس کی حالت بیان کے قابل نہ تھی۔ وہ بیچارہ اپنے صدمہ سے خود چور تھا۔ اس صدمہ کی تاب نہ لاسکا اور وہ بھی ایک جگر خراش آہ کے بعد ختم ہوگیا۔ اس طرح اس خاندان کی بربادی ہوگئی۔ کوٹھی ابھی تک موجود ہے لیکن اس کے مکین زمین کے اندر آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ کوٹھی اب شکستہ حال ہوگئی ہے۔ کوٹھی کا ذرہ ذرہ ایک گزری ہوئی کہانی پر آنسو بہاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب یہ کوٹھی ایک یادگار رہ گئی ہے۔ اس طرح ایک منسوخ کی بربادی ہوئی۔ کوٹھی پر ایک تختہ لٹکا ہوا ہے جس پر سنہری حروف سے "مصوا منزل" لکھا ہوا ہے۔

وطن کی محبّت

جہاز کا رخ مشرق کی طرف تھا ہوا آہستہ آہستہ جہاز سے ٹکرا رہی تھی جیسے بھی جہاز ٹکرا رہی تھیں۔ لوگ کیبن میں کھڑے سمندر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ شام کا وقت تھا فریا کیبن میں کھڑا شفق کو دیکھ رہا تھا شفق کے دھندلے آثار اسے نظر آ رہے تھے۔ جوں جوں شفق صاف نظر آتی اس کی خوشی میں ایک تغیر سا پیدا ہونے لگتا۔ وہ اپنی آنکھوں کو بار بار مشرق کی طرف اٹھاتا۔ اس کی چند صیائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھتیں اور جھری دار چہرہ پر ہلکی سی سرخی کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ تھوڑی دیر تک یہیں میں بیٹھا رہا پھر کمرہ میں چلا گیا اور ایک صندوقچہ میں سے نوٹ اور زیور نکال کر دیکھنے لگا سونے چاندی کے زیور اور ہزاروں روپے کے نوٹ دیکھکر اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اسے یاد آ رہا تھا جب وہ چھوٹا تھا اس کے ماں باپ مر گئے تھے وہ سڑکوں پر بھیک مانگا پھرا کرتا تھا ایک دفعہ وہ شاہراہ پر بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک صاحب اور میم صاحب باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے اس کی ٹکر صاحب سے ہو گئی تھی۔ صاحب جھلا کر بولے تھے۔

"ڈیم فول" تم بڑا گدھا ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اپنی بیکسی پر رونے لگا۔ آج دو دو دن سے بھوکا تھا بھوک کی وجہ سے اسے چکر آ رہے تھے۔ اور اسی لئے وہ بے دھیانی میں صاحب کے اوپر گر پڑا تھا میم صاحبہ کو اس کی حالت دیکھکر ترس آ گیا وہ بولیں "ڈیر

ہم اس کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ اور وہ اُسے اپنے گھر لے آئیں تھیں۔ اور گرم گرم چائے اور ڈبل روٹی کھانے کو دی تھی۔ اسوقت اسے کھانوں میں بڑا مزہ آیا تھا۔ اس دن سے وہ صاحب کے یہاں کام کرنے لگا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ اسے اب بھیک نہ مانگنی پڑتی تھی۔ اور نہ فاقے کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی میم صاحبہ اس پر بہت مہربان تھیں۔ ان کے یہاں کا خانساماں عبدالرحیم بھی فرید کو بہت چاہتا تھا۔ وہ کبھی اپنی چھوٹی لڑکی زینب کو لے آتا اور دونوں گھنٹوں کھیلا کرتے اسے زینب کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا۔ وہ بھی بہت پیاری لڑکی تھی۔ ایک دفعہ فرید صاحب کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا میم صاحبہ مشین سے کپڑا سی رہی تھیں زینب آئی اور فرید سے بولی "فرید چلو کھیلیں گے۔ میں ہوں آج اپنی گڑیا لائی تمھارے گڈے سے شادی کرنے کے لئے"

میم صاحبہ ہنس کر بولیں "زینب تم کیوں نہیں فرید سے شادی کر لیتیں" فرید ہنسنے لگا تھا اور زینب شرما کر بھاگ گئی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑے ہوگئے اب وہ بچے نہ تھے بلکہ جوان ہو گئے تھے۔ اب فرید زینب کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا وہ اس سے کتراتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ پانی بھرنے جاتی اور فرید نظر آتا تو مسکرا دیتی۔ عبدالرحیم کو فرید بہت پسند تھا۔ اس لئے اس نے اس کی شادی زینب سے کردی۔ اب تو فرید کو منھ مانگی مراد مل گئی تھی۔ وہ اپنی نئی دلہن سے بہت خوش تھا۔ زینب بھی فرید پر نثار تھی۔ غرض وہ دونوں بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ یکایک زمانے نے پلٹا کھایا یعنی صاحب اور میم صاحبہ دوسرے شہر چلے گئے اس نے کتنی ہی کوشش کی کہ اسے کہیں نوکری مل جائے لیکن نوکری نہیں ملی ان لوگوں کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی دنوں زینب کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا بہت حسین تھا۔ اس لئے فرید نے اس کا نام حسین یوسف رکھا۔ زینب بچے کے نام پر فرید کو

حسن یار کہنے لگی تھی۔ فرید نے بھی اپنا نام تبدیل کرکے حسن یار رکھ لیا تھا۔ کئی کئی دن تک ان کو فاقہ کرنا پڑا۔ زیب بہت صابر عورت تھی وہ فرید سے کچھ شکوہ نہ کرتی۔ فرید خود زیب کی حالت دیکھ کر پریشان تھا وہ بیچاری فاقہ کرنے کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئی تھی۔ فرید اس کی مصیبت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ چاہے کتنی تکلیف برداشت کرے۔ لیکن اس کی زیب کو کچھ نہ ہو۔ ایک دفعہ جب کہ جھونپڑی میں چراغ ٹمٹما رہا تھا ایک ٹوٹی سی چارپائی پر زیب بچہ کو لئے سو رہی تھی۔ بھوک کی وجہ سے اس کا جسم لاغر ہوگیا تھا۔ بچہ کبھی کا بلک بلک کر سو چکا تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا جب اسے خراٹے کی آواز آنے لگی وہ اٹھا اور ایک نظر مکان پر ڈالی اسی طرح جس طرح چور چوری کے وقت مکان کا جائزہ لیتا ہے۔ اس نے آخری نگاہ بیوی بچہ پر ڈالی اور ایک رومال جو وہ خود اوڑھے ہوئے تھا اتار کر بچہ پر ڈال دیا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور پھر وہ نہ جانے کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنے کے بعد افریقہ پہنچا۔ وہ ابھی یہیں تک سوچنے پایا کہ اسے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ سامنے باورچی کھڑا تھا۔ اس نے روپیوں کو جلدی جلدی صندوقچہ میں رکھا اور یوں مخاطب ہوا۔

"کیا کھانے کی گھنٹی بجی ہے؟"

باورچی نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے صندوقچہ کی طرف دیکھا۔ فرید غصہ سے بولا "تم کیوں جواب نہیں دیتے"

باورچی نے اٹکتے ہوئے کہا حضور ...... جہاز بھنور ..... میں آگیا ہے خطرہ کی گھنٹی بجی ہے۔ اور باورچی سسکیاں لے کر رونے لگا۔ فرید سر تھام کر رہ گیا اس کو ہر ایک چیز گھومتی ہوئی نظر آنے لگی وہ چلایا خطرہ گھنٹی۔ اب میرا کیا ہوگا۔ میں زیب کو کس طرح یہ روپیہ زیور دے کر خوش کرسکوں گا" وہ کیبن کی طرف بھاگا جہاں سب لوگ جمع تھے۔ سب کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہر ایک غمگین تھا۔ وہ مسافر

جو پہلے اپنے وطن اور منزل مقصود پر پہنچنے کی آس میں خوش تھے۔ اب ہر ایک مایوسی میں غوطہ زن تھا۔ اس نے صندوقچہ کو بغل میں دبا لیا اور کپتان کے پاس پہنچا جو ادھر ادھر اطمینان سے ٹہل رہا تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ کپتان اتنا مطمئن کیوں ہے۔ کیا اسے جہاز کی بربادی کی خبر نہیں۔ وہ کپتان کے پاس جا کر بولا "کپتان اب کیا ہوگا"

کپتان حیرت سے پیچھے ہوئے بولا۔ "ہوگا کیا جہاز ڈوب جائے گا۔"

"آپ جہاز کے بچانے کی کوشش نہ کریں گے؟"

کیوں نہیں! میں نے تو بہت کوشش کی سب بے سود۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمارے جہاز کو ڈوبنا ہی ہوگا" وہ سنجیدگی سے بولا اور سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا اس کی گہرائی کا اندازہ لگا رہا ہے۔ فرید کو تعجب ہو رہا تھا کہ کپتان بھی عجب قسم کا آدمی ہے۔ اسکے چہرے سے کوئی خوف عیاں نہ تھا وہ اطمینان سے ادھر ٹہل رہا ہی کیا اسے اپنی زندگی کے کھونے کا غم نہیں فرید پھر کپتان کے پاس گیا اور بولا،

کپتان کوئی ایسی تجویز کیجئے کہ جہاز بچ جائے کیا آپ کو اپنی موت کا کچھ غم نہیں تھوڑی دیر میں یہ جہاز بھنور میں ڈوب جائے گا اور ہم لوگ اسی طرح سے ناپید ہو جائیں گے کہ جیسے کبھی دنیا میں پیدا ہی نہ ہوئے۔ کیا آپ کو اس سانحہ کی یاد سے غم نہیں؟"

"غم کرنے سے کیا فائدہ! میں اپنا عزیز وقت رنج و غم میں کیوں ضائع کروں"

کپتان مسکرا کر بولا۔ فرید اس جواب سے ناامید ہو گیا اسے جہاز کے ٹکڑے ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور خود کیبن جس پر یہ لوگ بیٹھے تھے ہلنے لگا۔ فرید نے پھر ایکبار صندوقچہ کو دیکھا اور پھر سمندر کے پانی کو اور پھر اس کی نظر ایک بہتے ہوئے تختہ پر جا پڑی اسکی آنکھوں میں خوشی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ فرید پانی میں کود گیا تھا اس نے تختہ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن تختہ دوسری طرف بہہ گیا

اس نے پھر ایک بار کوشش کی اب کے وہ تختہ پر تھا لیکن اس کی مایوس نگاہیں جس میں خون کے آنسو جھلک رہے تھے دوسری طرف بہتے ہوئے صندوقچہ پر تھیں۔ جب تک صندوقچہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ وہ اس کی طرف برابر دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے حسرت ٹپک رہی تھی غم کی بات ہی تھی کہ عمر بھر کی کمائی اور خوشی کا سہارا یوں پانی کی نذر ہو گیا۔ اب وہ ایک ناپو میں تھا اسکو کسی چیز کی تلاش نہ تھی اسے دنیا فریب معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے درخت کا سہارا لیتے ہوئے آہ لی وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بھی کیوں نہ سمندر میں ڈوب کر مر گیا جب کہ اس کی زندگی کا سہارا اس سے چھین لیا گیا ہو اس نے مشرق کی طرف نگاہ ڈالی جب کی بہ نسبت اب کی نگاہوں میں بہت فرق تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں سے وطن پہنچنے کی خوشی ٹپک رہی تھی۔ اور اب یاس اور غم نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو غوطہ زن تھے۔

اس نے اپنی ناتوان ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ گویا وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اسکی ٹانگیں اس کے وطن پہنچنے تک ساتھ دے سکتی ہیں یا نہیں لیکن وہ مایوس ہو چکا تھا لیکن اس کی ہمت نے جواب نہ دیا تھا وہ سمندر کے کنارے چلنے لگا سمندر کے کنارے اس نے کیا دیکھا۔ وہ اسے رونے پر مجبور کر رہے تھے۔ جہاز پاش پاش ہو چکا تھا مسافروں کی لاشوں پر چیل کوے منڈلا رہے تھے۔ اسے ایک لاش نظر آئی جس پر چیل کوے بری طرح گر رہے تھے۔ اس نے پاس جا کر دیکھا نہ کپتان کی لاش تھی۔ اس نے لاش کو ادب سے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا کیونکہ اسے مسرت کی تلاش تھی اور مسرت صرف وطن میں تھی۔ وہ چلتا ہی گیا یہاں تک کہ اس کے پیروں نے جواب دے دیا۔ تلوؤں میں چھالے آ گئے۔ حلق خشک ہو گیا لیکن اس کے دل میں اب بھی وطن کی محبت تازہ تھی۔ اس نے مصیبتوں کی کچھ پرواہ نہ کی اور چلتا گیا یہاں تک کہ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی اور اس کی آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی اب اسے

دنیا کی ہر ایک چیز شام کے دھندلکے کی طرح نظر آتی۔ وہ بالکل لاغر ہو گیا تھا اس کے
لئے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ لیکن اس کے دل میں وطن کی محبت کا چراغ
روشن تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی صرف
سانس آتا جاتا تھا۔ وہ وہیں پڑے پڑے دنیا کے نشیب و فراز دیکھ رہا تھا اس نے
دیکھا کہ بہار آئی اور چلی گئی خزاں کا دور دورہ ہوا۔ پھر زمین مخملی فرش بن گئی اس کے
بعد وہ خاک نظر آنے لگی وہ سب کچھ دیکھتا رہا اور دنیا کی بے ثباتی پر آنسو بہاتا
رہا۔ اسے ایک جہاز نظر آیا جس کا لال جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اسنے سوچا کہ اس جہاز
کو معلوم نہیں کہ اس پر بھی گردش ہے میں دنیا کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں۔ اس کو
گذرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا کہ کسطرح جہاز کو بھنور میں پھنس جانے کی وجہ سے اس پر تباہی
آئی تھی کہیں یہ جہاز بھی برباد نہ ہو جائے۔ اس نے دیکھا جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے
اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب تک نہ کھولیں جب تک
اس کے کانوں میں کسی کے سسکنے کی آواز نہ آئی اس نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکا
جس کے کپڑے پانی سے شرابور تھے اور بال پریشان تھے وہ بیٹھا اپنی قسمت پر رو رہا
ہے۔ بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ شاید تمہیں بھی
وطن کی یاد ستا رہی ہے۔ بیٹا میں بھی تیری طرح اجڑا ہوا آدمی ہوں رونے سے کیا
فائدہ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح جہاز پر اپنے وطن جا رہا تھا میں بہت خوش تھا
میرے دل میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میرا جہاز تباہ ہو جائیگا۔ جوان نے بوڑھے کی
آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "بابا میری اور آپ کی قسمت جدا ہے
میں تو اپنے گمشدہ باپ کا پتہ لگانے نکلا تھا جو کہ افریقہ میں بہت نام پیدا کر کے
وطن واپس آ رہے تھے لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ انکا اب تک پتہ نہ چلا۔"

بوڑھے کو اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔ وہ بولا "بیٹا تیرے باپ کا نام کیا ہے؟"

حسن یار" لڑکا سنجیدگی سے بولا۔

"اور تم حسین یوسف ہو" بوڑھا خوشی کو دباتے ہوئے بولا۔

لڑکے نے تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ کہ اسے اس کا نام کیسے معلوم ہوگیا۔ لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بوڑھے نے لڑکے کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ میرے بیٹے تو وطن کی پہلی منزل ہے میں نے تجھے پالیا۔ یعنی وطن کو بھی پالیا۔ اب میں آسانی سے مر سکوں گا۔" یہ کہتے کہتے بوڑھے کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ اس دنیا سے چل بسا۔ جوان کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل کر بوڑھے کی پیشانی پر جا پڑے۔ دنیا کہہ رہی تھی کہ اسے کہتے ہیں وطن کی محبت کہ جب وطن کی پہلی منزل نظر آئی جب ہی روح بھی پرواز کر گئی۔

حُسن

جب فضا پر ہریالی چھا جاتی ہے۔ چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ بہار آ گئی۔ بہار کی نشانی پھول کھلنا۔ کومل کا کوکنا تتلی کا تھرکنا ہے۔ جب لوگوں کو یہ سب چیزیں نظر آتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ بہار کا موسم ہے اور جب ہرے بھرے درخت سوکھ جاتے ہیں پھول مرجھا جاتے ہیں فضا پر اداسی چھا جاتی ہے ہر کیف اس سے آنکھوں میں تراوٹ نہیں پہنچتا تو لوگ کہتے ہیں کہ خزاں کا دور دورہ ہے کیا دنیا اسی لیے قائم ہے کہ بہار آئے اور چلی جائے۔ خزاں حکمراں ہو اور پھر بہار کی آمد اس پیچیدہ مسئلہ کو ابھی تک حل نہیں کیا گیا ہے اسی طرح زندگی اور موت کا اہم سوال ہے۔ انسان کو زندگی کس لیے عطا کی گئی ہے۔ کاش ہم صحیح حل نکال سکتے۔ اور زندگی کا انجام کیا ہے۔ کیا زندگی کا انجام یہی ہے کہ موت آ جائے اور اس کے بعد نہ ختم ہونے والی خاموشی ....

بیابان جنگل میں جب رات کی سیاہی چھا جاتی ہے۔ دریا کا بہتا ہوا پانی تھم جاتا ہے۔ پنچھی بند ہو جاتے ہیں فضا پر ہو کا عالم چھا جاتا ہے تو ایک قبر پر جو کہ جھیل کے کنارے بنی ہوئی ہے ایک لڑکی جس کا حسن پھیکا پڑ چکا تھا چاند کا ٹکڑا تو ضرور تھی لیکن آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی چاندنی نہیں ہے یہ لڑکی جس کی ہر ایک ادا سے شاہانہ شان ٹپکتی ہے قبر پر آ کر اپنے آنکھوں کے موتیوں کا ہار نثار کرتی ہے

ایک گزری ہوئی یاد پر ایک نہ ختم ہونے والے افسانے پر اس کی آہ وزاریاں ستمگر
چاند بھی دامن میں منہ چھپا لیتا ہے۔ اور انجم خوف سے تھرتھرانے لگتے ہیں یہ مقتل
قبر جس پر ایک دوشیزہ اپنے قیمتی موتی نچھاور کرتی ہے زمانہ کو کیا معلوم کس کی قبر ہے
لوگوں کا خیال کیا وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ قبر ملکہ حسن کی ہے جس کے حسن کا ڈنکا
کبھی چار دانگ عالم میں بجتا تھا جس کے نہ ختم ہونے والے حسن پر لوگ دانتوں تلے انگلی
دبا لیتے تھے جس کی نرالی آنکھیں ہمیشہ مخمور رہا کرتی تھیں جس کی لمبی لٹیں ناگن سے مشابہ
کی جاتی تھیں اور جس کا مرمریں جسم آئینہ کے مانند چمکتا تھا۔ یہ اسی ملکہ حسن کی قبر ہے جو کہ
یوسف جیسے پروقار بادشاہ کے دل پر حکومت کرتی تھی لیکن آہ اب نہ وہ محل ہے نہ اس کا
حسن صرف ایک لو باقی رہ گئی ہے۔ اس کی بربادی کی داستان بہت دردناک ہے
اس ملکہ کو اپنے حسن پر بہت ناز تھا اس کا پروقار سر کسی کے آگے نہ جھکا تھا سوائے
خدا کے۔ اس کی آنکھوں سے ہمیشہ غرور ٹپکتا تھا۔ اس کے غرور کا انجام کیا ہوا جس حسن پر
اسے ناز تھا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ یہ ملکہ لفظ غربت سے ناآشنا تھی۔ اصلی دنیا
غریبوں کی دنیا سے دور رنگینیوں کی دنیا تھی اسکا مقصد صرف رنگینیوں میں گم ہوکر رہنا تھا
اسے کیا معلوم غریبوں کی دنیا کیا ہے اور امیر لوگ ان پر کس قدر ظلم کرتے ہیں۔ ان
اور اس کے ستائے ہوئے لوگوں کے نالے جن سے فلک ستمگر بھی کانپ اٹھا۔ ان سب
باتوں سے وہ قطعی بے بہرہ تھی۔ اسکی بربادی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ ایک دفعہ
جبکہ وہ اپنے محل کی بالائی منزل سے نیچے اتر رہی تھی اسے بربط کے نغمے کی آواز آئی
کوئی بربط بجا رہا تھا اس قدر سریلی تانیں تھیں کہ فضا جھوم رہی تھی یہ متوالی
ملکہ بھی عشق ہیجان کی سیل کی طرح جھومنے لگی جب وہ نیچے اتری تو تب اس نے
دیکھا کہ پھاٹک کے پاس ایک دس گیارہ سال کا لڑکا جس کے چہرے سے معصومیت اور
افسوس دونوں عیاں تھے۔ بربط بجا رہا تھا پھٹے ہوئے کپڑے جسم پر تھے۔ بال پریشان تھے

بربط کی تانوں میں ملکہ اس طرح کھو گئی کہ اس نے لڑکے کا بھی خیال نہ کیا یوسف جبکہ باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا وہ بھی بربط کے نغمے سننے میں مصروف تھا بربط کے تاروں پر لڑکے کی انگلیاں آہستہ آہستہ ناچ رہی تھیں یکایک وہ رک گئیں۔ ملکہ لڑکے کی طرف متوجہ ہوئی اور خفگی سے کہا "نادان لڑکے تم اس قدر ابتر حالت میں کیوں رہتے ہو غریب لوگ واقعی میں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں"۔

لڑکے کے نازک ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی وہ تمکنت سے بولا کیا آپ کم ستمگر ہیں جو ہمیں ظالم بتاتی ہیں حسن کا ذخیرہ جو صرف تمہارے حصے میں آیا ہے کیا ہزاروں کے دل کو نہیں لوٹ لیا۔ کتنوں کی دنیا برباد کر دی تم نے کیا کیا ظلم نہیں کئے سمجھیں کسطرح بتایا جائے کہ تم محلوں کی ملکہ ہم غریبوں کی دنیا کے ظلم جانو ہم پر کس قدر ظلم کئے جاتے ہیں آہ! ہماری صبح بھی ہوتی ہے تو ہزاروں مصیبتوں کا پیام لاتی ہے اور تم لوگوں کی شام نئے عیش و آرام کا پیام ہوتا ہے ہماری شام بھی ہوتی ہے تو ہماری بے بسی پر آنسو بہاتی ہے اور رات ہمارے لئے زحمت ہے ہم کلفتوں سے چور مزے کی نیند سو جاتے ہیں۔ دنیا میں کیا ہم ہی لوگ ظلم کے لئے رہ گئے ہیں۔ خدا کو تم جیسے امیروں پر ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ ہمارے پھول جیسے نرم و نازک بچے جن کے پھلنے پھولنے کے دن ہوتے ہیں مفلسی کی بھیانک چڑیلیں انھیں نگل جاتی ہیں ہم پروان بھی نہیں چڑھنے پاتے ہیں۔ ہمارے ننھے ننھے دل ہمیشہ پیاسے رہتے ہیں ہمیں کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا فاقہ کی بھیانک شکل ہمیشہ ہماری منتظر رہتی ہے۔ ہماری آہ و زاریاں کوئی نہیں سنتا۔ ہمارے دل ہلا دینے والے نالے سنکر بھی چرخ اپنے ستم سے باز نہیں آتا۔ اور تم کہتی ہو ہم اپنے پر ظلم کرتے ہیں۔ کاش آپ ہماری دنیا دیکھ سکتیں"۔

لڑکا ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اس نے نہ تھمنے والے آنسو رخساروں پر

بہرہ ہے تھے۔ وہ نہایت بے بسی کے انداز میں مڑا اور جانے لگا۔ ملکہ حسن پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ اس نے لڑکے کو آواز دی "پیارے بچے! تم کہاں جا رہے ہو"؟
لڑکا بولا "محترم خاتون! تمہارے حسن کی یاد آنسو بہانے بیاباں کی طرف جا رہا ہوں"۔
ملکہ نے حیرت سے کہا "میرے حسن پر آنسو بہانے"؟
"ہاں" لڑکا بولا "جب آپ کا حسن مٹ جائیگا جب آپکی یاد دنیا والوں کے دل سے ختم ہو جائے گی تو آپ کا غلام آپ کے حسن کی یاد میں دور کہیں آنسو بہایا کریگا۔ لڑکا بربط بجاتا ہوا چل دیا ملکہ خاموش رہی اس کی عجب کیفیت تھی اس کا پھول سا چہرہ کملایا جا رہا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ یوسف نے ملکہ کو رنجیدہ دیکھ کر کہا۔
بیگم! تم بھی ان چھوکروں کی باتوں میں آجایا کرتی ہو بھلا کبھی ایسا ہو سکتا ہے"
ملکہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے وہ بولی "حضور یہ سب سچ ہے اتنا کم سن لڑکا ایسی باتیں کبھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو میری اِصلاح کے لئے آیا ہے۔ اور میری آنکھوں پر سے غرور کا پردہ ہٹا دینا چاہتا ہے"
ملکہ کے رخساروں پر آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی وہ آہستہ آہستہ اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئی۔ دن بھر ملکہ نے کچھ کھایا پیا نہیں وہ اُداس بیٹھی رہی لوگوں کو کیا معلوم کہ جس ملکہ نے کبھی آنسو نہیں بہایا وہ آج اس قدر کیوں رو رہی ہے۔ ملکہ کی اُداسی کا سبب صرف یوسف جانتا تھا یوسف نے ملکہ کو بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ خوش نہ ہوئی اس نے اپنی بچی "فیروزہ" جو کہ دو دن کی تھی اسکی بھی پرواہ نہ کی۔ روتے روتے وہ سو گئی۔ اب وہ خوابی دنیا میں تھی۔ اسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بیابان جنگل میں کھڑی ہے اسکے کانوں میں درندوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اس نے

دیکھا کہ خوفناک شکل دیو نے اسے گھیر رکھا ہے اور دانت نکالے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اس کا حسن چھین لینا چاہتے ہیں۔ ملکہ دیو کی خوشامد کرنے لگی وہ منت سے کہہ رہی تھی کہ "میرا حسن نہ چھینو۔ مجھ پر رحم کرو" دیو خوفناک آواز سے چلائے۔ وہ کہہ رہے تھے تو نے لوگوں پر بہت ظلم کئے ہیں۔ اسکی سزا تجھے ملنی چاہئے اگر تو اپنا حسن نہ دیگی تو ہم تیری بچی تجھ سے چھین لیں گے" ملکہ نے دیکھا ایک خوفناک شکل کے دیو کی گود میں اس کی بچی تھی اور وہ ڈرا رہا تھا۔ بچی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس سے اپنی بچی کا رونا نہ دیکھا گیا وہ چلائی "خدا کے واسطے میری بچی مجھے دیدو۔ میں اپنی بچی کو کسی حالت میں تمہارے حوالے نہ کروں گی۔ تم میرا حسن لے سکتے ہو میں نہ سمجھی تھی کہ یہ عارضی حسن ہے حسن سے کہیں زیادہ مجھے اپنی بچی عزیز ہے۔ میری بچی مجھے واپس کر دو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی" اور ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی نصف شب اس وقت گذر چکی تھی آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے فضا پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا وہ اٹھی اور بچی کی پنگوڑے کی طرف گئی جہاں فیروزہ آرام سے سو رہی تھی۔ ملکہ نے بچی کو پیار کیا اور یوں مخاطب ہوئی "مجھے معاف کرنا فیروزہ اب میں تجھ سے نہ مل سکونگی تو اپنی ماں کو بیوفا نہ کہنا میری بچی اگر میں تجھ سے جدا نہ ہونگی تو تیری جان کا خطرہ ہے" اور وہ روتی ہوئی پنگورہ کے پاس سے چلی آئی۔ ایک گلابی رنگ کا دوشالہ اس نے اوڑھ لیا اور محل کے باہر آئی محل پر آخری نگاہ ڈالی اور یوں مخاطب ہوئی "خدا حافظ اے میرے محل۔ تم پر راج کرنے والی ملکہ جا رہی ہے۔ کہاں؟ یہ اسے خود ہی نہیں معلوم۔ تم میرے راز داں ہو۔ میں کسی برے کام کی نیت سے نہیں جا رہی ہوں"

ملکہ نے آخری نظر محل پر ڈالی۔ وہ جا رہی تھی رات کے سناٹے میں اس کے کانوں میں بچی کے رونے کی آواز آئی وہ ٹھٹکی پھر اسنے اپنے آپ ہی کہا "نہیں نہیں

مجھے جانا ہوگا۔ میری بچی اس میں خطرہ ہے۔ مجھے زندہ رہنا ہے اس کے آگے قدم اٹھائے۔ شال اس کے سر سے اڑا جا رہا تھا لمبے بال ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے اس نے شال کو اچھی طرح سمیٹ لیا۔ تاکہ وہ اس کے جسم پر سے اڑ نہ جائے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ اے چادر تو نے لاکھوں کی عزت بچائی ہے۔ مجھ سے کنارہ کش نہ ہو۔ میں پردہ نشین عورت ہوں۔ اے آسمان کے بسنے والے میری مدد کر مجھے اپنی پناہ میں رکھ کانٹے میرا دامن پکڑ رہے ہیں۔ شب کی سیاہی مجھے راستہ دکھانے سے پس و پیش کر رہی ہے۔ قدم میرا ساتھ نہیں دیر ہے ہیں تو اپنی قدرت دکھا۔ مہتاب کو علم دے کہ وہ میرے لئے شمع کا کام دے کانٹوں سے کہدے میرا دامن چھوڑ دیں مجھے چلنے کی قوت عطا فرما۔ اور ٹھنڈی ہوا کو حکم دے کہ وہ میری پاسبانی کرے غرض ملکہ اسی طرح بڑبڑاتی خدا سے شکوہ کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے قدم جواب دے چکے تھے پھر بھی وہ چل رہی تھی اس کے نازک پیر ٹھوکر کھا کھا کر لہولہان ہوگئے تھے۔ نجم اپنی آخری چمک دکھا کر گل ہو چکے تھے۔ صبح کی سپیدی آسمان پر پھیل رہی تھی لیکن ملکہ کو اسکی پرواہ نہ تھی کہ صبح ہو رہی ہے وہ چل رہی تھی اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ پندرہ دن تک وہ لگاتار چلتی رہی اس کے تلوے زخمی ہوگئے تھے دوپٹہ تار تار ہوگیا تھا۔ گداز جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا غزالی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ اس کا حسن مٹ چکا تھا لیکن پھر بھی حسن کی آخری جھلک اس میں موجود تھی نہ معلوم کتنے دن چلنے کے بعد اسے ایک بستی نظر آئی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے افلاس سے ستائے ہوئے لوگ بلکتے ہوئے بچے۔ پھٹے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی عورتیں جسم لاغر آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی فضا پر اداسی چھائی ہوئی وہاں کے ذرے ذرے سے غربت ٹپک رہی تھی۔ گندگی اور بدبو دونوں اس جگہ تھیں گویا یہی غربت کی نشانی ہیں ملکہ مندر کے پاس جا کر رک گئی مندر کی چوکھٹ پر ایک بوڑھا سنیاسی لیٹا ہوا تھا گیروے رنگ

کی چادر اس کے لاغر جسم کو چھپا رہی تھی گلے میں تسبیح کے دانوں کی مالا تھی سنیاسی کی جٹا شانوں پر پھیلی ہوئی تھی. گھنی داڑھی سینہ پر بکھری ہوئی تھی کھچڑی دار چہرہ تمتماتی ہوئی آنکھیں وہ ایک کھورا کمبل جو کہ جگہ جگہ سے پھٹا تھا اوڑھے ہوئے لیٹا تھا وہ ملکہ کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ "نمستے اے سُندرتا کی دیوی"!

ملکہ کے چہرہ پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی وہ مسکرا کر بولی۔ "بابا کیا تمھیں مجھ میں کچھ حُسن نظر آرہا ہے"؟

سنیاسی بولا۔ "ہاں مٹی ہوئی سُندرتا سُندرتا کی آخری جھلک۔ اے دیوی کبھی تم بھی ساوتری اور سیتا جیسی سُندر ہوگی"۔

تھوڑی دیر تک سنیاسی ملکہ کو غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "آؤ دیوی بھگوان تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمھارے لئے مندر کے پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم کس لئے آئی ہو۔ تمہارا رتن تم سے چھین لیا گیا ہے۔ تم اُسے بھگوان سے واپس لینے آئی ہو میں تمکو آشیرواد دیتا ہوں بھگوان کے چرنوں میں التجا کرو۔ تمھاری آشا قبول کریں گے بھگوان کسی کو اپنے دروازے سے واپس نہیں بھیجتے"۔

ملکہ آہستہ آہستہ بڑھی اور مندر کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی اور سادھو سے یوں مخاطب ہوئی۔ "اے بزرگ ترین ہستی مجھے دیوی نہ کہہ میں دیوی کے لائق نہیں ہوں میں کچھ لینے نہیں آئی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کچھ کھویا ہی نہیں۔ جسے واپس لینے آئی ہوں"۔

سادھو چونکا وہ ملکہ کی طرف تکنے لگا پھر بولا۔ "تم نے زندگی میں کچھ نہیں کھویا تو تم ضرور دیوی ہو دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جس نے اپنی زندگی میں کچھ کھویا نہ ہو۔ مجھے تو تم ساوتری معلوم ہو رہی ہو تم ہماری مدد کرنے کرنے کے لئے آئی ہو بھگوان بڑے اچھے ہیں آخر انھوں نے تمکو ہماری مدد کے لئے بھیج دیا۔ ہماری دِن

رات کی دعائیں اکارت نہیں ہوئیں اے دیوی میں تم سے التجا کرتا ہوں تم ہمارے لئے بھگوان سے دعا کرو۔ ہمارے گاؤں میں قحط پڑا ہے۔ لوگ دانے دانے کو ترس رہے ہیں ہمارے گاؤں کے آدھے سے زیادہ انسان بھوک کی وجہ سے مر گئے ہیں اور جو بچے ہیں ان کی مردے سے بھی بدتر حالت ہے۔ میں ہی نہیں بلکہ ہمارے گاؤں کے سب لوگ تمہارے پیر پڑتے ہیں دیوی ہمیں بچا لو جاؤ مندر کا پٹ کھلا ہے بھگوان بنسری۔ سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے ہمارے لئے التجا کرو بھگوان ہماری مصیبت دور کر دیں۔"

سادھو نے اپنا سر ملکہ کے پیروں پر رکھ دیا۔ ملکہ گھبرا گئی وہ اپنے پیروں پر سے سنیاسی کا سر اٹھا کر بولی: "مجھے گنہ گار نہ کرو۔ خدا کے سوائے کسی کے سامنے سر جھکانا گناہ ہے۔ میں خود فقیر ہوں تم ہی کہو فقیر بھلا فقیر کو کیا دے سکتا ہے۔ بلکہ میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں میں دنیا کی شور شوں رنج و غم سے گھبرا گئی ہوں اور سکون چاہتی ہوں ایسی خاموشی جس پر تقدیر بھی فدا ہو۔ مجھے کوئی ایسا راستہ بتا دو۔ جہاں ہر طرف خاموشی ہو۔ نہ دنیا کی شورشیں ہوں نہ کلفتیں۔"

سادھو آنکھوں میں آنسو لا کر بولا: "تم سکون چاہتی ہو۔ ہماری دنیا کو دیکھو کہ ہم کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ہمارا سب کچھ ہم سے بھگوان نے چھین لیا ہے دو مہینے سے ہم لوگ بھگوان سے آہ و زاری کر رہے ہیں لیکن بھگوان پر کچھ اثر نہیں ہوتا بھگوان پتھر کے ہیں اور اُن کا دل بھی پتھر کا ہے وہ پھر کیسے ہماری دعائیں سکتے ہیں ہمارے بچوں کو دیکھو بھوک کی وجہ سے کس طرح تڑپ رہے ہیں" سادھو کی آواز بھر آگئی اور آنسو اُس کے رخسار پر بہنے لگے۔ ملکہ ایک سرد آہ لیکر بولی: "میں سب کچھ جانتی ہوں میں نے دنیا کے ظلم و ستم سب کچھ دیکھے ہیں۔ میرے سینے میں بھی درد بھرا دل ہے۔ مجھے اپنی دنیا دکھانے سے معاف رکھو۔"

سادھو بولا "ہاں! سندرتا کو تو غریبی سے ہمیشہ کا بیر ہے۔ تم سندر ہو لیکن تم نہیں جانتیں یہ سندرتا کبھی مٹ جائے گی بھگوان ہم غریبوں کو حسن نہیں دیتا۔ اگر کبھی ہم میں سے کوئی سندر ہو جاتا ہے تو غریبی اسے چھین لیتی ہے تم نے "مہارانی حسن" کا نام تو سنا ہوگا۔ اسے بھی اپنے سندر پر بہت غرور ہے"۔

ملکہ "ملکۂ حسن" کا نام سنکر چونک پڑی۔ اور بولی "تم ملکۂ حسن کو فضول بدنام کرتے ہو۔ اس کے سینے میں بھی درد بھرا دل ہے"۔

سادھو بولا "تم کیا جانو وہ بہت مغرور مہارانی ہے"۔

"ایسا ہی ہو" ملکہ بولی اور اس کے رخسار دو آنسو بہنے لگے۔

سادھو ملکہ کی طرف دیکھکر بولا "بیٹی تم دل کی شانتی چاہتی ہو تو آؤ اس پاک جگہ میں اپنی زندگی گزار دو۔ خدا کے بھگتوں کو شانتی شانتی ہے۔ وہ دیکھو بھگوان کی مورتی ہے۔ جاؤ اس کے پیر پڑ دو"۔

ملکہ بولی "نہیں نہیں مجھے بھگوان کے چرنوں میں شانتی نہیں ملے گی۔ میں ایک مسلمان خاتون ہوں" اور ملکہ چل دی۔ سادھو حسرت بھری نظر سے دیکھتا رہ گیا۔ ملکہ چلتی گئی اس کی محنت رائگاں نہ ہوئی کیونکہ اسے ایسا بیابان مل گیا جیسا کہ وہ چاہتی تھی۔ یہاں پر چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی فضا پر بھی سنسان بخش خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جھیل کے بہنے کی آواز ترنم سے مستانہ تھی۔ ہوا میں اڑتے ہوئے پرند بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے دور کہیں مور ناچ رہے تھے یہاں پر مسرت کا ہر ایک سامان موجود تھا۔ ملکہ یہ جگہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی وہ خوشی سے چلا اٹھی "خدا تیری قدرت بھی کیا نرالی ہے تیری دنیا میں ایسی جگہ بھی ہے جہاں دنیا کا کوئی رنج و غم نہیں ہے میرا تو خیال بھی نہ تھا کہ اس قدر اچھی جگہ بھی ہے"۔

اب ملکہ بہت خوش تھی اسکی منھ مانگی مراد مل گئی تھی وہ دن رات خدا کی عبادت

میں مصروف رہتی۔ اُسے کبھی کبھی فیروزہ کی یاد ستاتی تھی۔

ایک دفعہ جب کہ چاندنی چھٹک رہی تھی۔ تارے آسمان پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ملکہ ایک درخت سے ٹکی ہوئی بیٹھی تھی۔ چاند کی کرنیں ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر ملکہ کے پیارے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی مخمور آنکھیں جن میں اب بھی کشش باقی تھی آسمان کی طرف چاند دیکھنے میں مصروف تھیں بال کی دو چار لٹیں کشادہ پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ قدرت کے نظارے دیکھنے میں مصروف تھی۔

فیروزہ کی ہلکی سی یاد اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنے خیال میں مگن تھی۔ اسے بربط کی آواز آئی اسی طرح کے نغمے جو اس نے بارہ برس پہلے اپنے محل میں سنے تھے وہ چونک پڑی جھیل کی طرف سے یہ آواز آ رہی تھی وہ جھیل کے کنارے پہنچی ایک خوبصورت جوان لڑکا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بربط بجانے میں مصروف تھا۔ ملکہ نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کے بربط کے نغمے اس نے کبھی اپنے محل میں سنے تھے وہ لڑکے کے پاس بیٹھ گئی۔ لڑکے نے ملکہ کو دیکھ کر بربط بجانا بند کر دیا۔ اور ملکہ کی طرف تعجب سے دیکھ کر کہا "محترم خاتون! آپ اس بیابان میں کیسے آئیں۔ کیا آپ بھی کسی کی یاد میں یہاں زندگی گزارنے آئی ہیں؟"

ملکہ ایک بے معنی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میرے بچے دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے اور نہ میں کسی کی ہوں۔ پھر کس کی یاد مجھے ستائے گی؟"

لڑکے کی حیرت بڑھ گئی وہ بولا "پھر آپ اس بیابان میں کیسے آئیں۔ ہاں میں سمجھ گیا آپ کبھی حسین ہوں گی اور اپنے حسن کی حفاظت کیلئے اس جنگل میں پناہ گزین ہونے آئی ہیں۔ کیونکہ عورتوں کو حسن بہت پیارا ہوتا ہے۔"

ملکہ نے تعجب سے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا حسن کی حفاظت جنگل میں کی جاتی ہے؟"

لڑکا بولا "کیوں نہیں۔ اگر ملکہ حسن بھی یوں جنگل میں پوشیدہ ہو جاتی تو اسپر دیو کیسے عاشق ہوتے؟" ملکہ غصہ سے بولی "کیا بک رہے ہو؟"

آپ کو معلوم نہیں کہ ملکہ حسن پر ایک دیو عاشق ہو گیا تھا کیونکہ وہ بہت حسین تھی وہ اُس پر اس طرح عاشق ہوا کہ اُسے غایب ہی کر لیا۔ اب اس کا دنیا میں وجود ہی نہیں"

ملکہ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "پھر کیا ہوا یوسف نے اس کی کوئی خبر نہ لی؟"

"کیا آپ اُسے جانتی ہیں؟" لڑکے نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں ملکہ حسن کی کبھی لونڈی تھی۔ بیچارہ یوسف ملکہ سے بہت محبت کرتا تھا اُس پر تو غم کا پہاڑ ہی ٹوٹ گیا ہوگا؟"

اور کیا بیچارہ اس کے غم میں پاگل سا ہو گیا ہے۔ اس نے چاروں طرف ڈھونڈ لیا لیکن ملکہ حسن کا پتہ نہ لگا۔ انعام بھی مقرر کئے لیکن بے سود بیچارے نے اس غم میں دو دو دن کھانا نہیں کھایا تھا" لڑکا بربط کے تار کو چھیڑتے ہوئے بولا

اب یوسف کی کیا حالت ہے۔

مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں مدتوں سے یہیں پر ہوں" لڑکے کی انگلیاں بربط کے تاروں پر ناچ رہی تھیں۔ ملکہ ایک آہ لیکر خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرہ سے فکر و غم عیاں تھا۔ ٹھنڈا سانس لیکر ملکہ نے کہا "بربطی تم یہاں کیسے آئے"

لڑکا سرد آہ لیکر بولا "کچھ نہ پوچھو کہ میں کس طرح آیا۔ ہزاروں مصیبتوں کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔ میں غریب تھا میرا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ میرے ماں باپ

بچپن ہی سے مر گئے تھے۔ میری پرورش ایک بربطی نے کی تھی۔ بربطی بہت غریب تھا اس کے پانچ بچے تھے۔ اسے خود مصیبت اٹھانی پڑتی تھی۔ لیکن وہ مجھ کو تکلیف نہیں دیتا تھا۔ اس نے ہی مجھے بربط بجانا سکھایا تھا۔ جب میں دس برس کا ہوا تو بربطی بھی مجھ کو اس دنیا میں بے سہارا چھوڑ کر چل بسا میں بربط بجا کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ کسی دن کوئی میرے بربط کے نغموں سے خوش ہوتا تو کچھ دیدیتا۔ ورنہ یوں ہی پڑ کر سو رہتا۔ میرے لئے دنیا میں خوشی و غم ایک تھا۔ ان میں کوئی تمیز نہ تھی۔ کلفتیں اٹھاتے اٹھاتے میں ان کا عادی ہو گیا تھا۔ فاقہ کرنا میرا معمول تھا۔ ایک دفعہ میں ایک ہوٹل کے پاس کھڑا بربط بجا رہا تھا۔ بہت سے لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ لوگ ملکہ حسن کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے ان کے منہ سے اس کے حسن کی بہت تعریف سنی۔ مجھے بھی خیال آیا کہ ملکہ حسن کو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ میں اپنا بربط بجاتا ہوا شاہی محل کی طرف گزرا۔ میں بہت اچھا بجا لیتا ہوں میرے بربط کے نغمے سننے کیلئے ملکہ آئی

"کیسی تھی ملکہ؟" ملکہ نے سوال کیا۔

لڑکا آنکھیں جھپکا کر بولا "بہت حسین آسمان کی حور معلوم ہو رہی تھی۔ محترم خاتون اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں ضرور کہوں گا کہ ملکہ کے حسن کی آخری جھلک آپ میں موجود ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" ملکہ نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

ہوتا کیا۔ باتیں ہوئیں میں نے ملکہ کو چڑانے کی غرض سے کہا کہ میں تمہارے حسن کی یاد میں بیابان میں آنسو بہانے جا رہا ہوں۔ میں نے یہ صرف طعنے سے کہا تھا ہاں اتنا تو ضرور کہونگا کہ وہ بہت حسین تھی۔ میں دنیا کی شور شغل سے گھبرا گیا تھا مجھے دل کے سکون کی تلاش تھی۔ مجھے یہاں پر آئے

کی وجہ سے دل کا سکون مل گیا۔ اب میں خوش ہوں" لڑکا ملکہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ملکہ شرارت سے بولی "تم کو اب کوئی تمنا نہیں ہے۔ ملکہ حسن کو بھی نہیں دیکھنا چاہتے؟"

"لیکن وہ ہے کہاں" لڑکا تعجب سے بولا۔

"پہلے کہو تم کو اس کے دیکھنے کی تمنا ہے؟" لڑکے کی آنکھوں میں ملکہ اپنی آنکھیں ڈالکر بولی

"ملکہ کو دیکھنے کو تو ایک دفعہ ضرور دل چاہتا ہے۔

ملکہ پھول کی پنکھڑیوں کو بکھیرتی ہوئی بولی۔ ملکہ حسن کو تو تم نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں البتہ تم اس کی لڑکی فیروزہ کو دیکھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی ماں کی ہم شکل ہوگی۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا" لڑکے نے کہا۔

تم بڑے بے اعتبار ہو۔ میں دعوے سے کہتی ہوں۔ فیروزہ بالکل ملکہ حسن جیسی ہوگی۔ اگر تم کو اس کی جھلک دیکھنی ہے تو فیروزہ کو دیکھ سکتے ہو" ملکہ لڑکے کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر بولی۔

"میں اسے ضرور دیکھوں گا" لڑکا جاتے ہوئے بولا۔

"ابھی جا رہے ہو" ملکہ بولی۔

تو کیا ہوا۔ میرے لئے کوئی وقت نہیں۔ میں ابھی جاؤں گا۔ لڑکے نے کہا" چار سال کا عرصہ ہو گیا۔ پر یطی نہیں آیا۔ ملکہ اس کا انتظار کر رہی تھی زمانے کے کتنے ہی پلٹے کھائے۔ بہار آئی اور چلی گئی زمانے کے ساتھ ساتھ ملکہ بھی کچھ بوڑھی ہوگئی وہ پریطی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ اُسے اپنی بچی فیروزہ کی خبر معلوم کرنے کا شوق تھا۔ اب وہ کچھ بیمار سی رہنے لگی تھی۔

ملکہ بہت لاغر ہوگئی تھی۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہ ایک درخت سے ٹکی ہوئی لیٹی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے خیال میں گم سی تھی۔ دُور سے اُسے بربط کے بجنے کی آواز سنائی دی وہ اُچھل پڑی۔ "بربطی آگیا۔ بربطی آگیا" وہ یہ کہتی ہوئی بھاگی۔ بربطی ملکہ کو اس طرح چلاتے ہوئے دیکھ کر بولا "خاتون! آپ اس قدر بے تاب کیوں ہیں"۔

ملکہ کے سینے میں خوشی کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ وہ بربطی کے بازو پکڑ کر بولی "میرے بچے! تم نے فیروزہ کو دیکھا کیسی ہے"۔

"آپ اطمینان سے بیٹھئے تو میں سب کچھ کہتا ہوں" بربطی ملکہ کے بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو تو بخار چڑھا ہے"۔ بربطی بولا۔

"ہوں" "پہلے تم فیروزہ کا حال تو کہو"۔ ملکہ بے تاب ہو کر بولی۔

میں نے فیروزہ کو دیکھا بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ بالکل اپنی ماں کی شبیہ ہے میں بربط بجاتا باغ کی طرف گزرا۔ وہ اُسی انداز سے کھڑی تھی جس طرح اُس کی ماں کو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ اُس کے جسم پر ہلکا گلابی دوشالہ تھا۔ وہ بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح مغرور نہیں تھی۔ بلکہ اُس کے چہرے پر معصومیت ٹپکتی تھی۔ وہ میرے بربط کے نغمے سننے میں اس طرح مصروف تھی کہ اُسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے شال اس کے سر پر سے گرا دیا۔ اُس نے شرما کر جلدی سے شال لپیٹ لیا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "بربطی تم نے کس سے بربط بجانا سیکھا ہے۔ تم کتنا اچھا بربط بجا لیتے ہو"۔ یہ تو آپ کی نوازش ہے۔ ورنہ مجھے کیا آتا ہے۔ میں نے بربط کو رکھتے

ہوئے کہا۔ اور میں دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا وہ کچھ اداس سی تھی "

"تم اداس کیوں ہو" میں نے سوال کیا۔

"نہیں تو" وہ گھبرا کر بولی۔ میں ہنسنے لگا۔

مجھ سے چھپاؤ نہیں شہزادی۔ تم ضرور غمگین ہو"

ہاں غمگین تو ہوں کیا کروں سوائے رونے کے مجھے چارہ نہیں جب میں دو دن کی تھی میری ماں مجھ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میرے والد کہتے ہیں کہ اس دن ایک بربطی آیا تھا میری والدہ اس کے بربط کے نغمے سُن کر بہت متاثر ہوئی اور دن بھر روتی رہی اور اسی رات سے وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تم ہی بتاؤ بربطی میں کیوں نہ غمگین ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی نہیں دیکھا۔ کاش میں ایک دفعہ دیکھ سکتی۔ میرے والد کہتے ہیں کہ میری ماں بہت حسین تھی اسکی ایک تصویر میرے پاس ہے۔ شہزادی کی آنکھوں میں آنسو چھلچھلا آئے۔ میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "واقعی تم بڑی غمگین ہو۔ لیکن اب غم کرنے سے کچھ فائدہ نہیں تم اپنی ماں کی تصویر مجھے دکھا سکتی ہو"

"ہاں" وہ بولی۔ اور تھوڑی دیر میں وہ ایک تصویر لے آئی یہ ایک بہت بڑی تصویر تھی۔ تصویر کے چوکھٹے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ ملکہ حُسن کی تصویر تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بربط تھا اور اس کی مرمریں انگلیاں تار کو چھیڑنے میں مصروف تھیں۔ میں فوٹو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد میں چلا آیا۔ فیروزہ بہت خوش اخلاق لڑکی ہے" بربطی پھول کی پنکھڑیاں مروڑتے ہوئے بولا۔ "اس کی آنکھوں سے جیسے کیف ٹپک رہا تھا وہ مدہوش سا ہوا جا رہا تھا۔ ملکہ گھبرا کر بولی "یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں بربطی۔ کہیں تم نے شراب تو نہیں پی لی"

وہ مسکرا کر بولا "شراب تو میں نے ضرور پی ہے۔ لیکن وہ انگور وغیرہ کی شراب نہیں ہے۔ اس شراب کو میں نے ساغر کے ذریعہ نہیں پیا ہے۔ بلکہ آنکھوں سے پی ہے"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو"

"چھوڑیے بھی اس ذکر کو" برطی نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ملکہ خاموش ہوگئی

ملکہ کا بخار دن بدن ترقی کرنے لگا۔ وہ بہت بیمار ہوگئی۔ برطی ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ برطی نے ملکہ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ملکہ برطی سے بہت خوش تھی۔ ایک دفعہ ملکہ کو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا وہ بخار میں مدہوش سی پڑی تھی۔ آنکھیں لال تھیں۔ برطی ملکہ کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ملکہ نے کروٹ لی۔ اور برطی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولی "تم کتنے اچھے ہو۔ میری کتنی خدمت کرتے ہو۔ میرے بچے تمہارا نام کیا ہے"

"میرا تو کوئی نام نہیں ہے۔ سب مجھے برطی کہتے ہیں"

"اچھا برطی میں تم سے ایک کام کرنے کو کہتی ہوں۔ کرو گے" ملکہ نے کہا۔

"ضرور کروں گا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ آپ جیسی بزرگ ہستی کے کام آؤں"

"تو سنو میرے بچے!" ملکہ برطی کا ہاتھ اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولی "میرے مرنے کے دن قریب ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب میری موت کا پیام آگیا ہے میری ایک تمنا ہے کہ میں مرنے سے پہلے فیروزہ کو دیکھ لوں۔ تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں ملکہ حسن ہوں۔

برطی تعجب سے بولا "آپ ملکہ حسن ہیں"

"ہاں سنو تو میں ملکہ حسن ہوں۔ اس دن تم نے جو مجھ سے باتیں کہیں تھیں

مجھ پر بغیر اثر کئے نہ رہ سکیں۔ میں دن بھر روتی رہی۔ رات کو مجھے ایک خواب نظر آیا بہت ہی خوفناک خواب تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اسی رات کو محل سے نکل پڑی۔ اور یہاں نہ جانے کس طرح پہنچ گئی۔ مجھے یہاں پر دل کا سکون تو ضرور مل گیا۔ لیکن روح میری ہمیشہ پھڑکتی رہی۔ مجھے فیروزہ کی یاد ہر وقت بے چین کرتی تھی۔ میں مرنے سے پہلے اُسے ایک دفعہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ بربطی تم جاؤ اور فیروزہ سے کہو کہ تمہاری ماں زندہ ہے۔ اور اُسے کسی طرح سے یہاں لے آؤ۔ تاکہ میں اُسے دیکھ سکوں" ملکہ حسن رونے لگی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بربطی ملکہ کی طرف تعجب سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ ملکہ کے ہاتھ چوم کر بولا" ملکہ میں ضرور تمہاری بچی کو لینے جاؤں گا" اس نے بربط اٹھایا اور چل دیا۔ جبتک بربطی اوجھل نہ ہو گیا۔ ملکہ اسکی طرف دیکھتی رہی۔ دو سال بعد بربطی شہنشاہ یوسف کے شہر میں پہنچا۔ جب وہ شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ تمام لوگ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور ماتم کر رہے ہیں۔ ایک بہشتی کنوئیں سے پانی بھر رہا تھا۔ بربطی نے پوچھا" کیوں میاں! ان لوگوں نے سیاہ کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں"؟

بہشتی مسکرا کر بولا" تم شاید اجنبی ہو جب ہی تو تم کو معلوم نہیں۔ آج دو دن ہوئے۔ ہمارے بادشاہ سلامت یوسف بہادر انتقال کر گئے ہیں"

بربطی سناٹے میں آ گیا۔ بہشتی اس کو یوں گم سم دیکھ کر بولا" کیوں صاحبزادے خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا تم کو بھی بادشاہ کی موت کا غم ہے"

"ہاں" ہم لوگوں کا فرض ہے کہ بادشاہ کی موت پر آنسو بہائیں۔ کیونکہ بادشاہ سب کا باپ ہوتا ہے۔ اور اپنے باپ کی موت پر آنسو بہانا ہمارا فرض ہے" بربطی نے یہ کہا اور محل کی طرف چل دیا۔ وہ باغ میں پہنچا۔ پھولوں کے ایک کنج کے پاس فیروزہ اداس بیٹھی تھی۔ بربطی اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا فیروزہ کو خبر نہ تھی۔ وہ بدستور

بیٹھی رہی۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بربطی خاموش کھڑا رہا۔ پھر یوں مخاطب ہوا "شہزادی اداس کیوں ہو"

فیروزہ ایک دم مُڑی۔ بربطی کو دیکھ کر مُسکرا کر بولی "بربطی تم آگئے"

"ہاں" "لیکن شہزادی تم اُداس کیوں ہو" بربطی اُس کے پاس بیٹھ کر بولا۔

اُداس کیوں نہ ہوں بربطی "ابھی تک میں اپنی ماں کا غم نہ بھلا سکی تھی کہ ایک تازہ غم اور ٹوٹ پڑا۔ میرے پیارے ابا دو دن ہوئے مجھے دنیا میں بے سہارا چھوڑ گئے"

فیروزہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ بربطی فیروزہ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر مغموم ہو کر بولا "اب کیا ہو گا شہزادی"

ہو گا کیا۔ اب مجھے تخت پر بیٹھنا ہو گا۔ میرے کوئی بھائی نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے ملکہ بنائیں۔ تمام تیاریاں ہو چکی ہیں۔ کل میری تاج پوشی کا دن ہے"

"تم ملکہ بننا چاہتی ہو" بربطی نے سوال کیا۔

نہیں مجھے ملکہ بننا پسند نہیں۔ غم مجھے کروٹ نہیں لینے دیتے۔ بھلا میں رعایا کو کیسے خوش رکھ سکوں گی۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی۔ رنج اور غم نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔ میں کیا خاک حکومت کر سکوں گی" شہزادی نے کہا

بربطی مُسکرا کر بولا "ایک بات کہوں شہزادی۔ تم ضرور خوش ہوگی۔ بولو! مجھے کیا انعام دو گی"

انعام جو کچھ مانگو دوں گی" ملکہ اپنی الماس کی انگشتری اتارتے ہوئے بولی۔

مجھے یہ انگشتری دے دو"

مجھے عذر نہیں یہ انگشتری میرے والد نے مجھے دی تھی۔ کہ جب میری شادی ہوگی تو میں اپنے ہونے والے شوہر کو دوں۔ لیکن میں تم کو دے

سکتی ہوں۔ کیونکہ شادی وغیرہ کے جھگڑے میں میں نہ پڑوں گی۔ شہزادی انگشتری کو بربطی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔ بربطی انگوٹھی واپس کرتے ہوئے بولا" بس یہ انگشتری نہیں لے سکتا۔ میں تو تمھیں آزما رہا تھا کہ تم شہزادی ہونے کے باوجود فراخ دلی رکھتی ہو۔ اچھا یہ سُن کر تم ضرور خوش ہوگی کہ تمھاری ماں زندہ ہے

فیروزہ ایک دم خوشی سے اُچک کر بولی "کیا تم سچ کہہ رہے ہو"

"ہاں" بربطی نے کہا۔

کہاں ہیں میری والدہ۔ مجھے میری ماں کے پاس لے چلو" شہزادی بیتاب ہو کر بولی۔ بربطی نے کہا۔ تمھاری ماں دُور بیابان میں تمھارا انتظار کر رہی ہے چلوگی تم"

ہاں تم رات کو اسی باغ میں آنا میں تمہارے انتظار میں رہوں گی اور پھر ہم دونوں میری ماں کے پاس چلیں گے"

اچھا" بربطی جاتے ہوئے بولا۔ رات کو بربطی باغ میں گیا۔ فیروزہ انتظار کر رہی تھی۔ فیروزہ نے بالکل سادہ لباس پہن رکھا تھا تاکہ کوئی اسے پہچانے نہیں۔ دونوں رات کے اندھیرے میں چل پڑے۔ چار سال کی طویل مسافت کے بعد وہ اُس بیابان میں پہنچ گئے۔ وہ دونوں جھیل کے پاس گئے جھیل کے کنارے ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ اور ایک سنیاسی بیٹھا ہوا تھا۔ بربطی نے سنیاسی سے پوچھا "یہ کس کی قبر ہے"

سنیاسی اُداسی سے بولا۔ مہارانی حُسن کی سمادھی ہے"

فیروزہ یہ الفاظ سُنکر چکرا کر گر پڑی۔ بربطی بھی خاموش تھا۔ فیروزہ قبر سے لپٹ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ میری ماں تم اپنی فیروزہ کا انتظار نہ کر سکیں تمھاری فیروزہ آگئی ہے۔ اٹھو مجھے گلے سے لگا لو"

سنیاسی فیروزہ کو قبر سے علیحدہ کر کے بولا "بیٹی اب رونے سے فائدہ نہیں تیری ماتا اب بھگوان کے پاس چلی گئی ہے۔ دعا کر کہ وہ اگلے جنم میں بھی تیری ماتا بنے۔ بھگوان ہر ایک کی دعا قبول کرتا ہے"

سادھو! اب میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ فیروزہ آگے نہ کہہ سکی۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ فیروزہ نے دیکھا بربطی وہاں نہ تھا۔ البتہ بربط پڑا ہوا تھا جس کے تمام تار بکھر گئے تھے۔ فیروزہ نے ادھر ادھر دیکھا لیکن بربطی نظر نہ آیا۔ فیروزہ نے چلا کر کہا۔ بربطی تم کہاں ہو"

سنیاسی نے کہا "وہ جھیل کی طرف گئے ہیں"

فیروزہ جھیل کی طرف بھاگی۔ وہاں جا کر دیکھا۔ بربطی نہ تھا۔ بلکہ پانی میں بلبلے اٹھ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بربطی پانی میں ابھی کودا ہو۔ فیروزہ چلائی "بربطی تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ تھے وہ کب کے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اپنی پیاری ماں کو نہ دیکھ سکی۔ میں کتنی بدنصیب ہوں۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔ اور وہ چھم سے پانی میں کود پڑی۔ اور اس طرح اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کی روح اب بھی ماں کی قبر پر آنسو بہانے آتی ہے۔ جب ساری دنیا بے خبر ہو جاتی ہے۔ دنیا کو کیا معلوم اس مظلوم کی روح ماں کی قبر پر آنسو بہاتی ہے۔ اس کی آہ و زاریاں بیابان کو تھرا دیتی ہیں اور اس کے نالے فرشتوں کے بھی دل ہلا دیتے ہیں۔ یہ ہے ایک حسن کی کہانی اور حسن کا انجام حسن کی بربادی کس طرح ہوئی۔ یہ تو آپ کو خوب معلوم ہو گیا۔



شہناز

شہناز میری کلاس فیلو ہی نہ تھی بلکہ دوست بھی تھی۔ وہ ہمارے کالج میں سب سے زیادہ زندہ دِل لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت شرارت ٹپکتی رہتی تھی۔ ہوسٹل میں میرے کمرہ کے بازو میں ہی اُس کا کمرہ تھا۔ ہم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ شہناز زیادہ خوبصورت تو نہ تھی۔ لیکن کالج کی ہر لڑکی اُس پر رشک کرتی تھی۔ اس کی سانولی سلونی رنگت، بڑی بڑی جھکی ہوئی آنکھیں گھونگریالے بال۔ ان سب نے اُسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس کی دِل آویز مسکراہٹ ستم ہی ڈھاتی تھی۔ وہ ایک طرف ہونٹ ترچھا کرکے ہنستی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں ہونے کی وجہ سے ہم لوگ اُسے "آہو چشم" کہتے تھے۔ وہ اِس خطاب سے بہت چڑتی تھی۔ جب مجھے اُسے چڑانا منظور ہوتا تو "آہو چشم" کہتی۔ وہ چڑ جاتی اور گھنٹوں مجھ سے نہ بولتی۔ وہ بہت ہوشیار تھی۔ ہر ایک مضمون اسے دو چار دفعہ پڑھنے سے یاد ہو جاتا تھا۔ اور ہم لوگ رٹا کرتے پھر بھی یاد نہ ہوتا۔ کالج کی تمام پروفیسرس اُس سے خوش تھیں۔ ہمارے ہوسٹل کی سپرنٹنڈنٹ "مس مادھوری" اُس پر بہت مہربان تھی۔ مس مادھوری کی عمر قریب چالیس برس کے ہوگی۔ لیکن وہ ابھی تک مس تھیں۔ ہم لوگ انھیں چڑایا کرتے تھے اِس لئے وہ ہم سے ناراض رہتی تھیں۔ اس کے برخلاف شہناز اُن کو کچھ نہ کہتی۔ اس لئے وہ اُسے بہت چاہتی تھیں۔ شہباز کالج کی طرح بناؤ سنگھار نہیں کرتی تھی۔

وہ ہمیشہ سادہ قسم کے شلوار اور ساڑی پہنتی۔ اور لڑکیوں کی طرح وہ بال گھنٹہ گھنٹہ بھر نہیں سنوارتی۔ بلکہ سادہ قسم سے بنا لیتی ہیں خود دو چوٹی ڈالتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی۔ فرحت تو ایک چوٹی کیوں نہیں ڈالتی۔ اتنے بناؤ سنگھار کی کیا ضرورت ہماری سپرنٹنڈنٹ مس مادھوری کو شہناز پر پورا اعتماد تھا۔ وہ ہر وقت ہم لوگوں پر اُس کو ترجیح دیا کرتی تھیں۔ اِس لئے ہم لڑکیوں نے سوچ لیا کہ مس مادھوری کو مزہ چکھانا چاہیئے۔ ایک دفعہ وہ آئینے کے سامنے کھڑی جوڑا باندھ رہی تھیں۔ ہم سب نے قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔ وہ خفا ہو کر بولیں: "تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ہنس کیوں رہی ہو" ہم لوگ ہنستے رہے۔ ہمارے گروہ میں عشرت سب سے زیادہ نڈر تھی۔ وہ مس مادھوری کے مُنہ بھی چڑھی ہوئی تھی۔ وہ ایک نیلے رنگ کا لفافہ بڑھاتے ہوئے بولی: "لیجیئے مسز مادھوری آپکا خط" ہم سب وہاں سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد معلوم نہیں عشرت پر کیا گزری۔ بات یہ تھی کہ مس مادھوری کو اگر کوئی مسز کہتا تو وہ بہت چڑتیں اِس لئے ہم نے یہ شرارت کی کہ ان کے نام ایک خط آیا اس پر مِس مادھوری لکھا ہوا تھا۔ ہم نے خط پر مس کے بجائے مسز لکھ دیا۔ ابھی ہم ہنس ہی رہے تھے کہ عشرت آئی۔ وہ بہت غصہ میں تھی۔ وہ مُنہ بنا کر بولی: "واہ جی تم نے تو ہمیں پھنسا دیا۔ اور آپ بھاگ آئیں مس مادھوری مجھ پر بہت بگڑیں۔ اور دو چار چپت بھی مجھ پر پڑے" ہم لوگ ہم قہقہہ لگا کر ہنسے۔ اسی وقت شہناز اور بیتو برآمدے میں سے آ رہی تھیں۔ شہناز بولی "کیوں جی! یہ کیا شرارت ہے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی اپنی اُستانی کو ستاتی ہو"

واہ! واہ واہ! تم تو مس مادھوری کی طرفداری تو ضرور کرو گی کیونکہ وہ آپ پر بہت مہربان ہیں" گلاب تنک کر بولی۔

شہناز طعنے سے بولی آپ کے کرم ہی ایسے ہیں کہ مس مادھوری آپ سے ناراض ہیں۔ کیوں فرحت تم بھی اس شرارت میں شامل ہو؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ میں خاموش رہی۔ غرض ہم لوگ اپنی شرارت سے باز نہیں آئے۔

روز نت نئی شرارت مس مادھوری کے ساتھ کرتے۔ یہ خبر سنکر ہم لوگوں کو تعجب ہوا کیونکہ مس مادھوری اب شہناز سے کچھ خفا رہتی تھیں۔ ناز نے اس کا سبب یہ بتایا کہ مس مادھوری نے دو چار خط جو شہناز کے نام آئے تھے دیکھے ہیں وہ سلیم نام کے لڑکے کے خطوط تھے مس شہناز سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب میں نے یہ سنا تو بہت خفا ہوئی اور ناز سے کہا۔

"ناز تم جھوٹ بول رہی ہو۔ شہناز ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

تم کیا جانو فرحت وہ جیلہ دیکھنے میں بہت بھولی ہیں۔ لیکن ہیں بہت عیارہ۔ گلاب جل کر بولی۔ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایسا نہ کہو گلاب میں شہناز کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ تمہاری شہناز سے دشمنی ہے اس لئے تم اس کی برائی کر رہی ہو۔"

وہ تنک کر بولی۔ "لو ان کو تو یقین ہی نہیں آتا۔ خیر میں اُس کی دشمن ہوں لیکن ناز کو تو اُس سے دشمنی نہیں۔"

کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یقین نہیں" میں نے جاتے ہوئے کہا۔

رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو گیا۔ کیونکہ میں ہر ایک کے منہ سے یہی الفاظ سنتی اور خود میں نے سلیم کا ایک خط دیکھا۔ ایک دفعہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی اپنی سہیلی شمع کو خط لکھ رہی تھی کہ شہناز کے کمرے سے آہستہ آہستہ بات چیت کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی دراز میں سے جھانک کر

دیکھا۔ شہناز اور مس مادھوری باتیں کر رہی تھیں۔ شہناز میز پر جھکی ہوئی تھی
اس کے پیچھے مس مادھوری کھڑی ہوئی تھی۔ اور ان کے ہاتھ میں ایک خط
تھا اُن کا چہرہ غصّہ سے لال تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں " شہناز مجھے تم سے
ایسی امید نہ تھی۔ بولو یہ کس کا خط ہے۔ سلیم سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"
شہناز بغیر کسی خوف کے بولی " سلیم میرا بھائی ہے۔"
اس کے بعد مادھوری نے نہ جانے کیا کہا۔ میں نے زیادہ سننا مناسب
نہ سمجھا۔ اب میں شہناز سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ شام کو میٹھی ہوئی چائے پی
رہی تھی۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے بناوٹی مسکراہٹ ہونٹوں
پر لاتے ہوئے کہا۔" آؤ شہنو! بیٹھو۔ چائے منگواؤں۔ پیو گی۔"
وہ بولی " چائے تو پی کر آ رہی ہوں۔ فرخو میں تم سے ایک بات پوچھنے
آئی ہوں۔ تم مجھ سے الگ الگ کیوں رہتی ہو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا " نہیں تو۔"
وہ تڑپ کر بولی " تم مجھ سے چھپا کیوں رہی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں
کہ میں تم پر شک کر رہی ہوں۔"
" کیسا شک " میں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔
وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی " سلیم کے بارے میں لڑکیاں نہ جانے
کیا کیا شک کرتی ہیں۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ وہ میرا بھائی ہے۔ وہ رونے
لگی۔ میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا " نہیں شہناز میں تم پر شبہ نہیں
کرتی ہوں۔"
وہ ہنس پڑی اور ہم دونوں سیر کرنے چل دیے۔ اُس دن سے پھر
میں نے سلیم کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ اگر کبھی کوئی لڑکی سلیم کے بارے

میں کچھ کہتی تو میں حقارت سے دیکھتی۔ رفتہ رفتہ کالج کی تمام لڑکیاں سلیم کے بارے میں جان گئیں۔ یہ بات ہوتے ہوتے پرنسپل تک پہنچ گئی۔ ایک دفعہ انھوں نے شہناز کو آفس میں بلایا وہ چلی گئی۔ ہم لوگ کالج کے دروازے کے پاس کھڑے سُن رہے تھے۔ مسز کھوٹے نے کہا۔ شہناز مجھے تمھارے کیریکٹر پر شک ہے۔ تم سچ سچ بتاؤ۔ سلیم جس کے خط تمھارے پاس آتے ہیں وہ کون ہے؟"

شہناز اسی انداز سے بولی۔ پرنسپل آپ کو میرے کیریکٹر پر شک ہے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ سلیم میرا بھائی ہے" پرنسپل خاموش ہو گئیں شہناز آفس سے باہر آئی تو اس کے چہرے سے کچھ خوف عیاں نہ تھا۔ قریشہ نے سوال کیا۔

"شہناز پرنسپل نے تم سے کیا پوچھا"

"تمھیں کیا واسطہ" وہ غصہ سے بولی۔ قریشہ خاموش ہو گئی میں نے قریشہ کو کہنی مار کر کہا "کیوں کسی کو چھیڑتی ہے" وہ تنک کر بولی۔ "تو بوا۔ یہ تو الٹے ہمارے سر ہو گئیں معلوم ہے کہ تم شہناز کی جگری دوست ہو"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک دفعہ جب کہ ہمارے سالانہ امتحان کے دن نزدیک تھے۔ گرمیوں کے دن گرمی کافی ہو رہی تھی میں دوپٹہ اتارے پڑی تھی۔ میرے ہاتھ میں ہسٹری کی کتاب تھی۔ میں وہی یاد کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا شہناز داخل ہوئی۔ وہی مسکراتا ہوا چہرہ نشیلی آنکھیں۔ اُس نے باریک قمیص پہن رکھی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر بولی۔ "آؤ شہنو! بیٹھو۔ یا اللہ کتنی گرمی ہے"

میں دوپٹہ سے پنکھا جھلتے ہوئے بولی۔ وہ میرے ہاتھ سے دوپٹہ لیکر بولی
فرحت اتنی گرمی میں تم نے اتنی موٹی فراک کیوں پہن رکھی ہے۔ گرمی تو زیادہ ہے
کیا کروں وہ موٹی دھوبن میری باریک فراک نہیں لائی میں نے لاپرواہی
سے کہا۔ وہ میری کتاب چھین کر بولی "کیا پڑھ رہی ہو"
ہسٹری۔ میں نے کتاب دکھا کر کہا۔
وہ بولی ہسٹری میں دھرا ہی کیا ہے بس قاضی دو دو چار دفعہ پڑھ ہاتی
ہیں۔ جب ہی مجھے یاد ہو جاتا ہے"
میں نے کہا "شہناز! میں تمہارے جیسے اعلیٰ خیالات کہاں سے
لاؤں" وہ ہنس کر بولی۔ کیا تیرے دماغ میں کوڑا بھرا ہے"
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ہنس پڑی۔
تھوڑی دیر بعد وہ بولی "فرحت معاف کرنا۔ میں نے تمہارا وقت ضائع
کیا۔ میری ایک بات ہے وہ تم کو ضرور ماننی پڑے گی"
میں نے شرارت سے کہا "میں سمجھ گئی۔ تم مجھ سے اپنی طرف سے سلیم
کو خط لکھانا چاہتی ہو۔ مجھے منظور ہے"
وہ چڑ کر بولی "اگر تجھے منظور ہو تو میں تیری طرف سے لکھدوں خط"
مجھے غصہ آگیا۔ وہ مجھے گدگدانے لگی۔ میں بھی ہنس پڑی وہ بولی "فرحت تم
ایسی بات ہی کیوں کرتی ہو جو مجھے بری لگے"
میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔ تمہاری بات تو سر آنکھوں
پر ہے"
آج سیر کو چلیں گے" وہ ہنس کر بولی۔
"کہاں" میں نے سوال کیا۔

جہاں سینگ سمائیں" وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی۔ دراصل میرا دل سیر کو جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ ہمارے امتحان کو ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ اور مجھکو بہت کچھ یاد کرنا تھا۔ لیکن شہناز کی بات کیسے ٹال سکتی تھی۔ اس لئے چپ ہو رہی۔ میں شام کو اپنے کمرے میں بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ کہ شہناز آپہنچی۔ آج اس نے دودھ جیسی سفید ساری پہن رکھی تھی۔ اور آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ آج اسکی آنکھیں اور غضب ڈھا رہی تھیں۔ وہ مجھ سے کنگھا چھین کر بولی۔ فرحو آج میں تیرے بال سنواروں گی۔ میں نے جواب میں بال بڑھا دیئے۔ وہ سادہ قسم کے بال بنانے لگی۔

میں نے کہا "شہناز مجھے ایسے بال پسند نہیں"

"کیوں" وہ کنگھا رکھتے ہوئے بولی۔

دیکھو شہناز! تمھارے بال گھونگریالے ہیں اسی لئے سادہ قسم کے بال بناتی ہو۔ تو بُرے نہیں لگتے۔ مجھے توپف والے بال بنا دو" میں نے کنگھا دیتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے بال بنا دیئے۔ پھر بولی "آپ چائے پیو گی یا سیر کو چلو گی"

چائے تو نہیں پیوں گی۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔

ہاں ٹھیک ہے واپس آکر کھانا کھا لیں گے" وہ میز پر ہاتھ ٹیک کر بولی۔

میں نے بادامی رنگ کی شلوار نکالتے ہوئے کہا "شہناز ذرا باہر چلی جاؤ۔ میں کپڑے بدل لوں"

یہ میلے رنگ کی شلوار پہنو گی" وہ میرے ہاتھ سے شلوار لے کر بولی۔

پھر کیا پہنوں" میں نے شلوار رکھتے ہوئے کہا۔
اُس نے گلابی رنگ کی ساڑی نکال کر کہا" یہ ساری پہن لو"
مجھے ساری پسند نہیں" میں نے ساری رکھتے ہوئے کہا۔
اُس کے اصرار سے میں نے ساری پہن لی۔ اور ہم دونوں چل دئے۔
جب ہم ہوسٹل کے گیٹ پر پہنچے تو ہمارے ہوسٹل کی مانیٹر جمنا باہر سے آرہی تھی
اُس نے مجھے دیکھ کر کہا" کہاں جارہی ہو فرحت"
سیر کو جارہی ہوں" میں نے جلدی سے کہا۔
دیکھو! کھانے کے وقت آجانا" وہ اندر جاتے ہوئے بولی۔
جب وہ اندر چلی گئی ہم نے اطمینان کا سانس لیا شہناز مسکرا کر بولی
آج تو بڑی ٹھنڈی تھی جمنا"
ہاں ورنہ ہمیں یوں ٹھنڈے دل سے کیوں اجازت دیتی" میں نے
کہا۔ مجھے تو یہ جمنا گلاب وغیرہ سے بہت چڑ ہے" شہناز نے کہا۔
میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ اُن سے ہماری بگاڑ نہ تھی۔ اب ہم
گیٹ کو عبور کر چکے تھے۔ ہم سبز گھاس پر اتراتے ہوئے جارہے تھے۔ شہناز
بہت اچھا گالیتی تھی وہ گارہی تھی۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا

اب ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ میں شہناز کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ کہاں تک
چلو گی۔ شام ہو رہی ہے"
اُس نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کرکے کہا" بس وہاں تک"
میں نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا" آج تو تھک بھی جائیں گے"
ہم جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ایک پتھر سے

میری ٹھوکر لگ گئی۔

شہناز ہنسنے لگی۔ میں نے جل کر کہا۔ "تم کو تو ہنسی آئے گی۔"

وہ بولی۔ "بس ناراض ہو گئیں میری بہن اتنی سی بات میں ناراض نہیں ہوتے۔" اب ہم ٹیلے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ شہنو ایک پتھر سے ٹیک کر بیٹھ گئی اور میں سبز گھاس پر لیٹ گئی۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے گھونگریالے بالوں کے لچھے پیشانی پر آ رہے تھے۔ وہ اُسے ہٹانے میں مصروف تھی۔ میں اُس کے چہرہ کی طرف تک رہی تھی۔ وہ میرے چہرہ پر نظر گاڑھتے ہوئے بولی۔ "کتنے بجے ہوں گے؟"

میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ "چھ بج کر پندرہ منٹ۔"

"ابھی آدھا گھنٹہ اور ٹھہرنا ہوگا۔" شہناز نے کہا۔

"لیکن کیوں۔" میں نے چڑ کر کہا۔

وہ متانت سے بولی۔ "مجھے سلیم کا انتظار ہے۔"

میں نے نفرت سے کہا۔ "اپنے منگیتر کا۔"

وہ بوکھلا گئی اور جل کر بولی۔ "ہاں اپنے منگیتر کا انتظار ہے۔ آخر دنیا سلیم کو میرا منگیتر کیوں کہتی ہے۔ جبکہ میں اُسے اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں دنیا پر ہنستی ہوں۔ دنیا مجھ پر ہنستی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں منگیتر کو بھائی کہتی ہوں۔ دراصل وہ میرا بھائی ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمہارے کوئی بھائی نہیں ہے۔" میں بولی۔

وہ ساری کا ایک کونہ مروڑتے ہوئے بولی۔ "دنیا یہی سمجھتی ہے کہ میرا بھائی نہیں ہے۔ لیکن یہ اس کی غلطی ہے۔ میرا بھائی ہے اور وہ ہے سلیم۔ یہ کیا پہیلی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ سلیم

تمہارا منگیتر ہے" میں نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔
یہ ایک داستان ہے" وہ سرد آہ لے کر بولی۔
"مجھ سے کہو" میں نے منت سے کہا۔ اس نے میرے چہرہ پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ بولی "سنو گی"
"کیوں نہیں" میں نے کہا۔
وہ درخت کا سہارا لے کر بولی "تم تو یہ جانتی ہو فرحت کہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی ہوں۔ اور اپنے ماں باپ کی لاڈلی۔ لاڈلی اس لئے ہوں کہ میرے ماں باپ رئیس ہیں۔ اگر وہ آج غریب ہوتے تو کبھی اتنا پیار نہ کرتے مجھے غریبوں سے ہمدردی ہے۔ اور امیروں سے نفرت ہے امیروں سے نفرت شاید اس لئے ہے کہ میں خود امیر ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کے آنکھوں کا نور ہوں وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اور ہمیشہ بیٹی کہتے ہیں۔ گھر کا بچہ بچہ میری خوشامد کرتا ہے۔ آخر کیوں؟"
شہناز کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ پھر یوں کہنے لگی "میرے باپ جو کہ رئیس ہیں جن کی گردن کسی کے سامنے نہیں جھکی۔ وہ میری ادنیٰ سی خواہش پوری کرنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں اور وہ ہر وقت مجھے بیٹا کہتے ہیں۔ آخر وہ میرا نام کیوں نہیں لیتے گھر ہی میں نہیں بلکہ باہر بھی میری خوشامد ہوتی۔ جب میں اسکول جاتی تھی۔ لڑکیاں مجھے بہن کہتی تھیں۔ اور اُستانی مجھے بیٹی کہتی تھیں وہ تمام لڑکیوں سے زیادہ مجھے چاہتی تھیں۔ لوگ میری خوشامد کیوں کرتے ہیں شاید اس لئے کہ میں دولت مند ہوں اور ماں باپ کے بعد یہ دولت میری ہے۔ میں اپنے باپ کی دولت کی تنہا وارث ہوں۔ مجھے دنیا سے نفرت ہونے لگی تھی

شہناز آگے کہنا چاہتی تھی لیکن رُک گئی۔
میں نے کہا،" اگر تم کو تکلیف ہوتی ہو تو نہ کہو"
اب شروع کیا ہے تو ختم کر لینے دو فرحو۔ وہ فضا میں گھورتے ہوئے بولی
ہاں تو یہی باتیں سوچ کر میں اُداس رہتی تھی۔ بہت کم ہنستی اور بولتی تھی۔
اتنی سب دولت، عیش و آرام ہونے کے باوجود بھی مجھے ایک کمی محسوس
ہوتی۔ مجھے خیال ہوتا کہ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا۔ میری امی مجھے ہمیشہ
خوش کرنے کی کوشش کرتیں۔ وہ ہمیشہ میرے لئے ریشمی کپڑے اور زیور
بنواتیں لیکن مجھے سادگی پسند تھی۔ اس لئے میں ہمیشہ سادہ کپڑے پہنتی
میں اپنا وقت زیادہ تر پڑھنے میں گزارتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کلاس میں ہمیشہ
اوّل رہتی۔ میں سیر و تماشہ میں بھی بہت کم حصہ لیتی"۔
امی نے میری خاطر بیڈمنٹن کوٹ بنوا دیا تھا۔ لیکن میں بیڈمنٹن بھی
بہت کم کھیلتی تھی۔ وہ میری ہر ایک خوشی کا خیال کرتیں۔ ایک دفعہ ہم لوگ
موٹر میں بیٹھ کر سیر کرنے جا رہے تھے۔ ایک دوکان کے سامنے بہت ہی خوشنما
کار کھڑی تھی۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ واہ واہ کیا عمدہ کار ہے"۔
شہنو! تجھے یہ کار پسند ہے"! امی نے کہا۔
"ہاں" میں نے غیر ارادی طور پر کہدیا۔ دوسرے دن میں کمرہ میں بیٹھی
کچھ پڑھ رہی تھی۔ امی آئیں اور مجھ سے بولیں" بیٹا تیرے لئے تمھارے
ابا کتنا اچھا تحفہ لائے ہیں" میں باہر آئی۔ باہر وہی موٹر کھڑی تھی جو
میں نے پسند کی تھی۔ میں بولی" میں نے تو یہ موٹر نہیں منگوائی"۔
ماں بولیں" تو نے نہیں منگوائی تو کیا ہوا۔ ہماری شہناز کو جو چیز پسند
ہے ہم نہ خریدیں۔ میں خاموش ہو گئی۔ میں بھی اپنی والدہ سے بہت محبت کرتی

تھی۔ ایک دفعہ جب کہ میں میٹرک میں پڑھتی تھی۔ میری ایک سہیلی ناہید نے شام کو پانچ بجے مجھے چائے پر بلایا۔ مجھے کوئی کام نہ تھا۔ اس لئے میں ساڑھے چار ہی بجے چلی گئی۔ اسوقت ناہید غسل کر رہی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی سامنے گول میز پر ایک فوٹو رکھا ہوا تھا۔ یہ فوٹو ایک نوجوان کا تھا۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ اس کے بالوں کے لچھے پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ میں تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ ناہید آ گئی۔ اور مجھے منہمک دیکھ کر بولی۔ "شہناز تمہیں یہ تصویر پسند ہے نا؟"

میں نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا "ہاں پسند ہے"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ مجھے اُس کی ہنسی ناگوار گزری۔ اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے پھوپی زاد بھائی تسلیم کی تصویر ہے۔ بی۔ اے میں پڑھتے ہیں"

میں نے شرارت سے کہا۔ "تو بڑی خوش قسمت ہے۔ منگیتر تو کافی حسین ہے"

وہ جل کر بولی۔ "ایسا ہی پسند ہے تو تم کر لو نہ شادی"

میں نے غصہ سے کہا۔ "ناہید جب وہ تیرا بھائی ہے تو میرا بھائی نہیں مجھے اس قسم کے مذاق پسند نہیں"

وہ خاموش ہو گئی۔ اُس کے بعد میری اور تسلیم کی ملاقات ہوگئی اور ہم لوگ قریب قریب ایک دوسرے سے روز ملتے تھے۔ مجھے تسلیم بہت پسند تھا ہم دونوں میں محبت ہو گئی تھی لیکن ایسی محبت نہیں جس میں دنیا کی ہوس ہو

. . . .

. . . . ہم ایک دوسرے کو بھائی بہن سمجھتے تھے۔ لیکن دنیا ہماری پاکیزگی نہیں دیکھ سکی اور ہم لوگوں کے

متعلق نہ جانے کیا کیا افواہیں اڑنے لگیں۔ میری امی اور ابا تک یہ بات پہنچ گئی لیکن انھوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ میرا میٹرک کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ سلیم بھی بی۔اے میں پاس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے پاس ہونے کی خوشی میں مجھے دعوت دی۔ میں دعوت میں گئی۔ کھانا کھانے کے بعد سلیم نے مجھ سے کہا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ جا رہا ہے۔ میں نے البم میں سے اس کا ایک فوٹو نکال کر کہا سلیم یہ مجھے دیدو۔"

"کیا کرو گی شہناز" اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

میں نے ہند کرتے ہوئے کہا "میں کچھ بھی کروں تم دے دو"

اچھا لے لو لیکن یاد رہے شہناز اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ لوگ ہمارے متعلق نہ جانے کیا کیا چہ می گوئیاں کر رہے ہیں" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے

"کیا چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں" میں نے انجان بن کر کہا۔

تم بھولی ہو شہنو۔ تم نہیں سمجھتیں۔ دنیا ہماری محبت میں شک کرتی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔ سلیم آگے نہ کہہ سکا۔ اس کا گلا بھر آیا۔

"لیکن ہم تو بہن بھائی ہیں" میں نے کہا۔

"لیکن دنیا تو نہیں سمجھتی" وہ بولا۔ میں اس کا فوٹو لے کر چلی آئی وہ دوسرے دن کلکتہ چلا گیا۔ میں نے وہ فوٹو کتاب میں رکھ دیا۔ اتفاقاً وہ فوٹو اماں کے ہاتھ لگ گیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے"

میرے بھائی کی تصویر ہے۔ میں نے سادگی سے کہا۔

تیرا بھائی کہاں مر رہا ہے۔ وہ ڈانٹ کر بولیں۔

میں غصہ سے بولی۔ "میرا بھائی کیوں نہیں ہے" امی خاموش ہو گئیں انہی دنوں ہمارے متعلق بہت کچھ پھیل گیا تھا سلیم کے خط آتے تھے۔ وہ اماں

کے ہاتھ لگ گئے اور نا اُمید ہونے بھی اماں کے کان بھرے۔ اماں میری شادی سلیم کے ساتھ کرنے کو تیار ہو گئیں۔ جب میں نے یہ سُنا تو بہت روئی۔ جسے میں بھائی سمجھتی تھی اُسے میرا سرتاج بنایا جا رہا تھا۔ میں انکار تو کر ہی نہ سکتی تھی اس لئے میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا "میں اور پڑھنا چاہتی ہوں" اس طرح میں کالج میں آ گئی۔ مجھے یہاں پر آ کر دل کی خوشی نصیب ہو گئی۔ اب میں خوش ہوں۔ یہ کہہ کر شہناز خاموش ہو گئی۔ اُس کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے شہناز؟" میں نے کہا۔

سوچوں گی کیا فرخ اب گھر جاؤں گی تو میری شادی سلیم سے ہو گی میں نے اس گناہ سے بچنے کے لئے ایک ترکیب نکال لی ہے۔ میں نے سلیم کو خط لکھا ہے کہ وہ آ جائے اور ہم اس گناہ سے بچ کر دور کہیں چلے جائیں گے۔ جہاں ہم بھائی بہن ہو کر زندگی گزار دیں گے۔" شہناز خاموش ہو گئی۔

وہ بُت کی طرح خاموش تھی۔ میں نے کہا "اب بہت شام ہو گئی ہے۔ چلو ہوسٹل چلیں"۔

کہاں چلوں ہوسٹل؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا بس اب سلیم آتا ہی ہو گا۔ میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لئے۔" شہناز نے کہا۔

میں نے آبدیدہ ہو کر کہا "کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے؟"

"ہاں" وہ رو پڑی تھوڑی دیر کے بعد سائکل پر ایک خوش رُو جوان آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رُک گیا "یہ میری راز دار سہیلی ہیں" شہناز نے کہا۔ شہناز مجھ سے گلے ملی۔ میں بھی رونے لگی۔ وہ بولی "مجھے امید ہے فرخ تم یہ راز کسی سے نہ کہو گی۔

کیا تم کو مجھ پر اعتماد نہیں" میں نے کہا۔ اس نے آخری نظر مجھ پر ڈالی اور چلی گئی۔ میں واپس ہوسٹل چلی آئی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ سیدھی اپنے کمرہ

میں آکر سو گئی۔ دوسرے دن مس مادھوری نے مجھ سے دریافت کیا۔ شہناز کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" میں بولی۔

"تمھارے ساتھ وہ کل سیر کو گئی تھی" مس مادھوری نے کہا۔

"لیکن وہ تو سینما چلی گئی تھی۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد شہناز کے متعلق بہت کچھ چہ می گوشیاں ہونے لگیں۔ اُس کے ماں باپ کو بھی خبر کی گئی کہ شہناز بھاگ گئی۔ اخباروں میں اس کے متعلق دل کھول کر لکچر دیے گئے اُس کو آوارہ بدمعاش قرار دیا گیا اور نہ جانے کیا کیا بیہودہ الفاظ اس کی شان میں استعمال کئے گئے۔ انھیں دنوں ہمارے کالج کی چھٹیاں ہو گئیں اور میں سہارن پور چلی آئی۔ میں نے کالج چھوڑ دیا اب میں شہناز کو کچھ کچھ بھول گئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا میں برآمدے میں ننھی ننھی کی فراک سی رہی تھی نرگس سوئٹر بن رہی تھی۔ نوکر نے اسی وقت ایک لفافہ لاکر دیا۔ لفافہ پر میرا نام لکھا تھا۔ میں نے خط کھولا۔ آپا کا خط تھا۔ انھوں نے مجھے سیر کے لئے آگرہ بلایا تھا۔ میں نے امی کو خط دکھایا۔ انھوں نے کہا چلی جانا دوسرے دن میں اور میری چھوٹی بہن نرگس آگرہ روانہ ہو گئے۔ آپا ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ننھا نوید تو میرے پاس سے ہٹتا ہی نہ تھا میں نے آپا سے کہہ دیا تھا کہ میں آگرہ آئی ہوں تو بغیر سیر کئے نہ جاؤں گی۔ انھوں نے بھی وعدہ کر لیا تھا۔ شام کا وقت تھا آپا ننھے نوید کا کرتہ سی رہی تھیں میں پاس ہی کرسی پر بیٹھی اپنا افسانہ پڑھ رہی تھی۔ نرگس ننھے نوید کے ساتھ باہر کھیل رہی تھی۔ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "آپا آج موسم کچھ خوش گوار سا ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ کہیں سیر کو چلیں۔"

آپا سوئی میں تاگہ ڈالتے ہوئے بولیں۔ کہاں چلوگی؟"
"تاج محل کی سیر ٹھیک رہے گی" میں نے رسالہ رکھتے ہوئے کہا۔
اچھا تم لوگ تیار ہو جاؤ، میں ٹیکسی منگواتی ہوں" آپا نے اٹھتے ہوئے کہا ہم لوگ تیار ہو گئے۔ ٹیکسی بھی آگئی۔ اور ہم لوگ تاج محل دیکھنے کے لئے چل دیے۔ تاج محل کی خوب سیر کی۔ پھر میں نے کہا۔" آپا اب کسی ہوٹل میں چلو"
بھئی تم گریجویٹ ہو مجھے تو ہوٹل جانے سے جھجک محسوس ہوتی ہے" آپا بولیں۔" اس میں حرج ہی کیا ہے!" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔
آپا بولیں "مجھے ڈر ہے کہ تمھارے دولھا بھائی نہ خفا ہوں"
دولھا بھائی اتنے دقیانوسی نہیں ہیں۔ میں نے منت کی وہ راضی ہوگئیں ٹیکسی والے نے ہمیں ایک ہوٹل میں چھوڑ دیا۔ ہم لوگ ہوٹل میں گئے۔ آپا مردوں کو دیکھ کر شرما رہی تھیں۔ میں نوید کو گود میں بٹھاتے ہوئے بوائے سے کہا۔ چائے لاؤ۔ لڑکا چلا گیا۔ ہم لوگ گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں ایک دُبلی پتلی عورت چائے لاتی ہوئی نظر آئی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ شہناز تھی۔ میں نے تعجب سے کہا۔" شہناز تم کہاں" اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور چائے میز پر رکھ کر جانے لگی۔ میں نے دوبارہ کہا "تم اپنی فرحو کو نہیں پہچانتیں۔
وہ اسی انداز سے بولیں۔" میں دنیا کی ہر ایک شے کو بھول چکی ہوں"
میں نے اپنے پتہ کا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔" شہناز کل شام کو آنا میں تمھارا انتظار کروں گی۔ وہ چل دی۔ آپا اور نرگس میری طرف تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔ ننھے نوید نے کہا۔ خالہ یہ کون تھی؟"

میں نے نوید کا گال سہلاتے ہوئے کہا "منّے جب میں علی گڑھ میں پڑھتی تھی تو یہ چائے بناتی تھی" منّا چپ ہو رہا۔ آپا اور نرگس نے بھی کچھ نہ کہا۔ ہم لوگ اپنے گھر چلے آئے۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ شہناز جیسی تعلیم یافتہ لڑکی ہوٹل میں نظر آئے۔ یہی خیالات مجھے ستا رہے تھے۔ صبح اٹھی ناشتہ کیا۔ دن بھر کچھ کام نہ تھا۔ اس لئے میں سہ پہر سے باہر کرسی نکال کر بیٹھ گئی دولھا بھائی نے کہا "کس کا انتظار ہو رہا ہے"

کسی کا بھی نہیں"۔ میں بولی۔ ننھا نوید دوڑا آیا۔ اور باپ کے پیروں سے لپٹ کر بولا "پاپا ہماری خالہ ان کی سہیلی میری کا انتظار کر رہی ہیں"

دولھا بھائی مسکرا کر بولے "میری تو آج نہ آئے گی کیونکہ اس کا آج میچ ہے۔ میں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "تو میں اس کا انتظار ہی کب کر رہی ہوں"

دولھا بھائی ہنستے ہوئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد نرگس آ کر بولیں۔ "اے ہے باجی کس کا انتظار ہو رہا ہے"

میں نے غصّہ سے کہا "تم لوگ مجھے ستا کیوں رہے ہو"

نرگس چلی گئی۔ میں بیٹھی رہی۔ شام ہو گئی لیکن وہ نہیں آئی میں اٹھ کر جانے ہی والی تھی کہ وہ آتی ہوئی نظر آئی۔ میں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی وہ مجھے دیکھ کر زار و قطار رونے لگی میں نے اسے گلے سے لگا لیا میں اسے کرسی پر بٹھانے لگی تو وہ بولی "فرخو بہن میرے ایسے نصیب کہاں" "ایسا نہ کہو شہنو! میرے دل پر چوٹ لگتی ہے میں سب کچھ جانتی ہوں تم بے قصور ہو" میں نے رسالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

فرخو! مدت کے بعد تم سا ہمدرد ملا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ خوب روؤں اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ رونے سے کیا فائدہ۔ یہ تو

بتاؤ تمھاری یہ غیر حالت کیسے ہو گئی ؟"

سوال تو انوکھا ہے فرحت۔ جب بادشاہ تک گداگر ہو گئے تو میں کیا ہوں۔ یہ سب قسمت کے چکر ہیں"

میں غصہ سے بولی: "تم قسمت کا کھلونا کیوں بنی ہو۔ تم دنیا کو بتا سکتی ہو کہ تم کیا ہو۔ اور کیا کر سکتی ہو۔ تم نے نوکری کیوں نہیں کر لی"

وہ رو کھائی سے بولی۔ نوکری کیسے کرتی۔ میں تو اتنی بدنام ہو چکی ہوں کہ کوئی اپنے پاس کھڑا ہونے نہیں ہونے دیتا۔ ہوٹل میں بڑی مشکل سے جگہ ملی ہے"

لیکن مسٹر سلیم کہاں ہیں"

یہ نہ پوچھو فرحت۔ سوکھے زخم ہرے ہوتے ہیں۔ مرد کسی کے ہوئے ہیں نہ ہوں گے" وہ رو پڑی۔

میں نے حیرت سے کہا: "کیا وہ تم کو چھوڑ کر چلا گیا"

ہاں! اب وہ بچوں کے باپ بھی ہیں۔ ایک خوبصورت بیوی بھی ہے۔ مالدار بھی ہیں۔ وہ طعنہ سے بولی۔

اس نے تمھاری مدد نہیں کی"

مدد کیا وہ تو میرا نام تک لینا گوارا نہیں کرتے۔ جب وہ مجھے لے کر کلکتہ آئے تو ہمارے متعلق اخبار میں نہ جانے کیا کیا چھپنے لگا سلیم کو کوئی نوکری نہیں ملی۔ رفتہ رفتہ کلکتہ میں سب کو ہمارے متعلق معلوم ہو گیا۔ اس لئے سلیم کو نوکری نہ مل سکی۔ تم تو جانتی ہو فرحت! مرد غریبی سے کتنا گھبراتے ہیں وہ بھی گھبرا گئے۔ ایک دفعہ جب کہ میں روٹی پکا رہی تھی۔ گیلی لکڑیاں۔ آگ نہیں جل رہی تھی۔ میری آنکھیں سُرخ ہو گئیں تھیں۔ وہ آئے اور کہنے لگے۔ " مجھے

نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں مصیبت نہیں برداشت کرسکتا تم عورت ہو تم برداشت کرسکتی ہو۔ دوسرے مجھے اپنے ماں باپ کی یاد ستاتی ہے۔ میں اب جارہا ہوں۔ میں یہ سُن کر کانپ گئی۔ لیکن کیا کرسکتی تھی دوسرے دن وہ چلے گئے۔ میں اپنے ماں باپ کے یہاں نہ جاسکتی تھی۔ جاتی بھی کیا مُنھ لیکر۔ میں نے ایک جگہ ٹیچر بننے کی درخواست دی لیکن نامنظور ہوئی۔ وہ خاموش ہوگئی پھر ملاقات سلیم سے ہوئی" میں نے کہا۔ "ہاں ہوئی ہیں وہ سماں نہیں بھول سکتی۔ اُن کے ساتھ خوبصورت بیوی اور گود میں بچّہ تھا۔ میں جنگل میں لکڑیاں چننے گئی تھی وہ آگرہ شائد سیر کی غرض سے آئے تھے۔ یہاں پر وہ پکنک کے لئے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے منھ پھیر لیا۔ اُن کی بیوی بولیں۔ بڑی خوبصورت ہے یہ لڑکی۔ لکڑیاں چننے والی نہیں معلوم ہوتی۔ آپ جانتے ہیں اِسے"

وہ منھ بنا کر بولا۔ "میں نہیں جانتا۔"

مجھے یہ سنکر بہت رنج ہوا۔ اسی ہی غم میں دو دن بخار آگیا۔ اب میں سمجھی کہ دنیا میں مرد کسی کے نہیں ہوتے ہیں۔ عورتیں ہی ایسی ہیں کہ وہ ہر حالت میں صابر و شاکر رہتی ہیں۔" اُس نے سرد آہ لے کر کہا۔

میں بولی۔ "تم آگرہ کیسے آئیں۔"

میں کلکتہ میں ایک میم کے یہاں نوکر تھی۔ اُس کے بچّے کھلاتی تھی وہ آگرہ آئیں اور مجھے بھی لیتی آئیں۔ ان کا بچہ مر گیا۔ اب ان کو میری ضرورت نہ تھی۔ انھوں نے مجھے علحدہ کردیا۔ جب سے ہوٹل میں ہوں۔" شہناز بولی۔

میں نے کہا۔ "شہناز میرے یہاں رہو۔ میں تم کو اپنی بہن سمجھوں گی۔"

میں ایک بدنام لڑکی ہوں۔ تمہارے ساتھ کیسے گزارہ ہوگا۔ تمہارے ماں باپ راضی نہ ہوں گے۔" وہ بولی۔

میں امی۔ ابا کو راضی کروں گی۔ تم تو راضی ہو جاؤ"

نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی" وہ بولی۔

میں نے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا "اچھا یہ لے لو"

اس کی آنکھیں ایک دم لال ہو گئیں۔ وہ بولی "فرحو تم بھی مجھ کو غلام سمجھتی ہو لیکن میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں غلام ہی سہی لیکن میری روح آزاد ہے"

"میرا تو ہرگز یہ خیال نہ تھا" میں رنجیدہ ہو کر بولی۔

"اچھا جاتی ہوں" شہناز نے کہا۔ وہ چلی گئی۔ میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ شام ہو چکی تھی۔ میں اندر آ گئی۔ نرگس ریڈیو بجا رہی تھی۔ ریڈیو پر یہ گانا آ رہا تھا۔

"آئی بسنت بہار"

میں نے نرگس سے کہا ریڈیو بند کر دو۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

میں اپنے کمرہ میں آ گئی آج کمرہ کی آرائشی چیزیں بھی مجھ کو بری معلوم ہو رہی تھیں۔ دنمالا کی بڑی سی فوٹو میری میز پر رکھی تھی۔ مجھے دنمالا بہت پسند تھی۔ لیکن آج وہ بھی بری لگ رہی تھی۔ ریڈیو بج رہا تھا۔

"انسان کیا جو ٹھوکریں نصیب کی نہ سہہ سکے"

چراغِ سحری

صبح کی سپیدی پھیل چکی تھی۔ نسیم سحری پنکھا جھل رہی تھی۔ بے چارے ملاح اپنے اپنے چپو سنبھالے کشتی کھیلنے جا رہے تھے۔ آج گلگت کے کمشنر سر نظام سری نگر میں تشریف لائے تھے۔ اس لئے بہت چہل پہل تھی۔ بوڑھے ملاح فضلو نے اپنی کشتی ٹھیک کر لی کیونکہ اُسے آج اپنے ہاؤس بوٹ میں سر نظام اور لیڈی نظام کو لینے جانا تھا۔ وہ جانے میں مصروف تھا۔
اُس کی نوعمر بیوی نرگس انگور کی بیلوں سے لگی ہوئی اُس کی طرف دیکھ رہی تھی فضلو ایک ساٹھ سالہ بوڑھا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اور اُس کی دوسری شادی نرگس سے ہوئی تھی۔ نرگس سترہ برس کی دوشیزہ تھی۔ اور اُسے اپنے بڈھے شوہر سے والہانہ محبّت تھی۔ نرگس حُسن ہی کی نہیں بلکہ حُسنِ سیرت کی بھی مالک تھی۔ گلابی دوپٹہ شانوں پر پڑا ہوا تھا۔ چاندی کے جھمکے اس کے کانوں میں جھوم رہے تھے۔ خوبصورت پیشانی کو جھومر چوم رہا تھا۔ ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی اور انگلیوں میں بھرپور چھلے۔ اُس نے لال رنگ کا چُست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور اسی کی ہم رنگ قمیص۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں اپنے شوہر کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ جب اُس کا شوہر واپس آئے گا تو ایک نوخیز کلی کو اس کی گود میں دیکھے گا۔ فضلو اپنی بیوی کی

طرف دیکھ کر مُسکرایا اور نہایت محبت سے کہنے لگا: "گھبرانا نہیں میں دو دن بعد واپس آجاؤں گا۔ اور تیرے لئے کنگن لاؤں گا۔ مجھ سے تیرے ہاتھ ننگے نہیں دیکھے جاتے۔ اور لوگوں کی بہوں بیٹیوں کو دیکھو تمام زیور پہنے رہتی ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے فقیر کے لونڈے سلیمان اپنی جورو کے لئے نگ کے جڑے ہوئے کنگن لایا ہے۔ میں تیرے لئے ضرور کنگن لاؤں گا۔ بوڑھے ملّاح نے آخری نظر نرگس پر ڈالی اور چلتا بنا۔ نرگس نے سرد آہ لی۔ اور جب فضلو آنکھوں سے تہ اوجھل ہو گیا۔ وہ برابر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ فضلو ندی کنارے آیا تو دیکھا سر نظام اور لیڈی اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ فضلو نے معذرت چاہتے ہوئے کہا: "صاحب اگر دیر ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے میری گھر والی نے تو مجھے چھ بجے ہی اٹھا دیا تھا۔ لیکن آنے میں دیر ہو گئی"

سر نظام مُسکرائے اور نہایت شفقت سے بولے: "کوئی ایسی دیر نہیں ہوئی۔ ہماری بیگم صاحبہ سیر سپاٹے کی بڑی شوقین ہیں۔ مجھے جلدی گھسیٹ لائیں۔ سر نظام لیڈی نظام کی طرف دیکھ کر بولے جو اپنے کوٹ کا بٹن لگا رہی تھی۔

فضلو نے سر نظام کا تمام سامان ہاؤس بوٹ میں رکھ دیا۔ اور پھر کیوں کے گلابی پردے ہٹا دیئے۔ ہاؤس بوٹ کے اوپر سنہری حرفوں میں "نشاط منزل" لکھا ہوا تھا۔ سر نظام ہاؤس بوٹ کا نام پڑھ کر مُسکرائے۔ اور اپنی بیگم سے یوں مخاطب ہوئے: "بیگم یہ غریب بھی کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں۔ اس بوڑھے کو نشاط کے معنی بھی نہ معلوم ہونگے یہ نام ضرور چرایا ہوا ہے"

لیڈی نظام اپنا چرمی بیگ رکھتے ہوئے بولیں: "اگر یہ لوگ ہاؤس بوٹ کا اتنا رنگین نام نہ رکھیں تو لوگ ان کی ہاؤس بوٹ کی سیر کیوں کریں واقعی میں کشمیر کے لوگ بہت غریب افلاس کے ستائے ہوتے ہیں۔ خدا نے

ان کو خوبصورتی تو ضرور دی لیکن عیش وعشرت سے محروم رکھا۔"

سر نظام نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور پردے ہٹا کر دوسرے ہاؤس بوٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ جو کہ سطح آب پر تیر رہی تھی۔ اس بوٹ کے نیلے پردے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور ایک میم صاحبہ اپنے بچے کو گود میں بٹھائے مسکرا رہی تھیں سر نظام لیڈی نظام کی طرف متوجہ ہوئے جو کہ سوئٹر بن رہی تھیں۔ سر نظام لیڈی نظام کا شانہ ہلاتے ہوئے بولے۔ "رونی یہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں ایک ہم بدنصیب ہیں آٹھ سال شادی کو ہوگئے۔ لیکن اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں۔"

لیڈی نظام نے مسز کرسیم کی طرف غلط نگاہ ڈالی۔ اور پھر اپنے شوہر کو دیکھا جو میم کے بچہ کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ لیڈی نظام نے سر نظام کا کاندھا اپنی طرف کرتے ہوئے کہا بس دیکھ چکے۔ آپ کو تو جیسے بچوں کا خبط ہوگیا ہے۔ اگر ایسا ہی بچوں کا شوق ہے۔ تو دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

"تم تو خفا ہوگئیں"۔ سر نظام بولے۔

خفا کیوں ہوں گی۔ چلو ہاؤس بوٹ کی سیر کریں۔" لیڈی نظام کھڑی ہو کر بولیں۔ سر نظام کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ کیونکہ بیگم کا کہنا کیسے ٹال سکتے ہیں۔ ورنہ اُن کا دِل تو اِس جنت فضا کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔

دونوں ہاؤس بوٹ کی سیر کرنے لگے۔ ہاؤس بوٹ میں ایک گول کمرہ تھا جس میں جا بجا آئینے لگے ہوئے تھے۔ اور ایک گول میز پر ایک خوبصورت گلدستہ رکھا تھا جس میں نرگس کے پھول لہرا رہے تھے۔ یہ گلدستہ فضلو کو اسکی بیوی نے چلتے وقت دیا تھا۔ لیڈی نظام نے نرگس کا ایک پھول بال میں لگا لیا

جس پر سر نظام بولے "روبی یہ کونسا پھول بالوں میں لگا لیا۔ نہ اس میں خوشبو ہوتی ہے اور نہ دل فریبی۔ یہ ملاح بھی بہت خشک مزاج ہے۔ گلاب کے پھول اسے نہیں ملے"۔

لیڈی نظام بولیں "اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ میں بتاؤں ملاح کی بیوی کا نام ضرور نرگس ہوگا۔ تب ہی تو اس کو یہ پھول پسند ہے"۔

سر نظام نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا "تمھیں کیسے معلوم ہوا!"

واہ مجھے معلوم نہ ہو۔ میں یہاں کی باشندہ ہی ہوں۔ یہاں پر نورجہاں اور نرگس بہت نام رکھے جاتے ہیں جب میں کالج میں پڑھتی تھی تو ہماری کلاس کی آدھی لڑکیوں کا نام نورجہاں اور نرگس تھا۔

دونوں باہر ملاح کے پاس آئے۔ ملاح کسی گہری سوچ میں غرق تھا اسکی نگاہیں جھیل کے نیلے پانی پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کے سوکھے ہاتھ چپو کھیلنے میں مصروف تھے۔ لیڈی نظام بولیں۔ "ملاح کیا تمھاری بیوی کا نام نرگس ہے"۔

بوڑھا اپنی خیالی دنیا سے چونک پڑا "کیا کہا آپ نے" وہ ندامت سے بولا۔ لیڈی نظام خفگی سے بولیں "تم نے سنا نہیں"۔

بوڑھا منت سے بولا "آپ کے سر کی قسم میں نے کچھ نہیں سنا"۔

وہ ذرا ٹھنڈی ہو کر بولیں "تمھاری بیوی کا کیا نام ہے۔

"نرگس" بوڑھا آہستہ سے بولا۔

لیڈی نظام نے سر نظام کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ سر نظام چین بجبین ہو کر بولے "ملاح تمھاری بوڑھی کو تو یہ نام زیب نہیں دیتا۔ یہ نام تو اپنی لڑکی کا رکھا ہوتا"۔

"صاحب! میری بوڑھی بیوی نہیں ہے۔ بلکہ وہ سترہ سالہ ہے۔"

لیڈی نظام تعجب سے بولیں "وہ تم سے محبت کرتی ہے؟"

بوڑھا ہنس کر بولا "محبت کیا وہ مجھ پر جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہے۔"

لیڈی نظام کی حیرت اور بھی بڑھ گئی وہ سر نظام سے بولیں "یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک سترہ سالہ لڑکی ایک بوڑھے سے محبت کرتی ہے۔"

خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ فضلو سے بولے "تم نے برا کیا جو اس سے شادی کر لی۔ اس کی شادی تو تم اپنے لڑکے سے کرتے تو بہتر تھا۔"

بوڑھا ذرا خفگی سے بولا "میرے کوئی لڑکا نہیں ہے۔"

سر نظام خاموش ہو گئے۔ لیڈی نظام اور سر نظام اندر چلے گئے اور بوڑھا پھر نرگس کی رنگین یاد میں مصروف ہو گیا۔ وہ بہت مسرور تھا اسے معلوم تھا جب وہ ۲ دن بعد واپس گھر جائے گا تو وہ ایک معصوم ہستی کو دیکھے گا۔ جو کہ نرگس کے گود میں کھیل رہی ہوگی۔ نرگس مجھے دیکھ کر مسکرائے گی اور حیلے سے آنچل اپنے چہرہ پر ڈال لے گی۔ میں اس کے ہاتھوں میں کنگھن پہناؤں گا۔ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھے گی۔ اس کی نگاہیں مجھے مخمور بنا دیں گی۔ اُف کس قدر رومان خیز ہوگی میری دنیا۔ بوڑھا انھیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ سر نظام اور لیڈی نظام ہنس رہے تھے۔ اسیطرح ۲ دن گزر گئے شام کے چھ بجے فضلو نے کشتی کنارے لگا دی۔ سر نظام اور لیڈی نظام اتر گئے سر نظام نے ملاح کے ہاتھ میں پانچ روپے پکڑائے اور چلتے بنے۔ بوڑھا ان کی طرف دیکھتا رہ گیا کیونکہ پانچ روپے بہت کم تھے۔ بوڑھا خاموش ہو رہا۔ کیونکہ ایسے ظلم ان پر آئے دن ہوا کرتے تھے۔ بوڑھے نے کشتی کو گھاٹ کے کنارے باندھا اور گھر کی طرف [illegible] اندھیرا کافی پھیل چکا تھا۔ آج مہینے کی آخری تاریخ تھی اسلئے چاند

بھی نہ نکلا تھا۔ فضا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ دسمبر کا آغاز تھا۔ کافی سردی ہو رہی تھی۔ بوڑھا ٹھٹھرتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے کلیجے پر تیر چلا رہے تھے۔ اُس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ اُسے خیال ہو رہا تھا کہ نہ جانے نرگس کی کیا حالت ہو۔ وہ ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا گھر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ لیکن اندر سے کچھ آواز نہ آئی۔ اُس نے پھر کہا "نرگس دروازہ کھول میں آیا ہوں فضلو"

پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے دروازہ کو دھکا دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ چارپائی پر نرگس لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس کی گود میں ایک بچہ پڑا ہوا تھا سرہانے ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ فضلو کو غصہ آیا کہ میں تو اتنی دیر سے باہر سردی میں کھڑا ہوں۔ اور اس نے دروازہ بھی نہ کھولا۔ پھر یہ کہہ کر اطمینان کر لیا کہ سو رہی ہے نرگس۔ وہ پاس ہی بورے پر بیٹھ گیا۔ وہ بچہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ فضلو بچہ کو دیکھ کر پھولا نہ سما رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ میں اپنے بچہ کا نام نسیم رکھوں گا۔ نرگس کو بھی نسیم نام بہت پسند ہے۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچہ رونے لگا۔ فضلو نرگس کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ "نرگس لو بچہ رو رہا ہے"

نرگس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بدستور خاموش تھی۔ اُس نے کروٹ تک نہ لی۔ فضلو کو غصہ آیا۔ اُس نے اِسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "کیا بے ہوش ہو گئی ہو۔ کب سے میں چلا رہا ہوں" نرگس نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ فضلو کا ماتھا ٹھنکا اُس نے نرگس کا ہاتھ دیکھا بالکل ٹھنڈا تھا۔ نبض بالکل نہیں چل رہی تھی۔ فضلو ایک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گیا۔ اُس پر ایسا غم ٹوٹا کہ وہ تاب نہ لا سکا۔ دوسرے دِن نرگس کو دفن کیا گیا۔ فضلو غم سے نڈھال ہو گیا تھا

اب اُسے دُنیا کی کوئی چیز اچھی نہ لگتی - وہ دن بھر بچہ کو لئے بیٹھا رہتا۔ کسی دیکھنے بھی نہ جاتا۔ اُسے فاقے بھی کرنے پڑتے - بچہ بھی بھوکا رہتا۔ اور بھوک سے چلاتا۔ وہ اس کے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا - اتوار کا دن تھا صبح سے بچہ بیہوش پڑا تھا۔ اُس نے دودھ بھی نہیں پیا۔ بوڑھا بچہ کو لئے بیٹھا تھا۔ بہت اداس تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بچہ بھی اس سے چھپنے والا ہے - رات کا وقت تھا کوئی بارہ بجے ہوں گے - لڑکا آنکھیں پھیرنے لگا۔ اُس کا سانس رُک گیا۔ اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے - بوڑھا گھبرایا۔ وہ بچہ کو سینہ سے چمٹا کر بولا "میرے بچے میں تجھے نہیں مرنے دوں گا۔ تجھے زندہ رہنا ہوگا۔ میں کسی نہ کسی طرح سے تجھے بچاؤں گا۔ وہ بچہ کو لے کر جھیل کی طرف بھاگا۔ یہاں پر آکر دیکھا بچہ مر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوگئے تھے - بوڑھا چلانے لگا۔ اُس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ چاندنی کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ دو سایے اس کی طرف آرہے ہیں - پاس آنے پر معلوم ہوا یہ دونوں سر نظام اور لیڈی نظام تھے - لیڈی نظام فضلو کو روتا ہوا دیکھ کر بولیں۔

"صاحب تم رو کیوں رہے ہو"

"صاحب میرا بچہ چل بسا" وہ روتا ہوا بولا۔

لیڈی نظام نے بچہ کو گود میں لے لیا اور اس کی نبض دیکھنے لگیں وہ بولیں "تم بڑے بے وقوف ہو - بچہ ابھی زندہ ہے۔ تم اسے مار ڈالو گے۔ اس کی ابتر حالت ہے۔ تم اتنی سردی میں اس کا خاتمہ کر دو گے۔ لیڈی نظام نے بچہ کو کوٹ میں چھپا لیا۔

سر نظام بولے "یہ بچہ ہم لئے جا رہے ہیں۔ تمہارے پاس یہ مر جائے گا" بوڑھے نے کہا "لیکن . . . ."

لیکن کیا تمھیں اپنے بچّہ کی موت عزیز ہے۔ یہ چند گھنٹہ کا مہمان ہے
اسے ہم بچائیں گے۔ ابھی ہم ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ اس کی حفاظت کریں گے۔
تم گھبراؤ نہیں۔ تم اپنا بچّہ کل آکر لیجانا۔ ہم لوگ پرسوں جارہے ہیں۔"
سر نظام بولے۔ بوڑھے نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بچّہ کی طرف دیکھتا
رہا۔ سر نظام اور لیڈی نظام بچّہ کو لے کر چلے گئے۔ وہ گھر واپس آگیا۔
اس کی ہڈی ہڈی میں درد تھا۔ اسے بخار بھی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ رات بھر بخار
میں پڑا کراہتا رہا۔ صبح بخار ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھا۔ وہ اپنے بچّہ کو لینے جا رہا تھا
جھیل کے اس پار ڈاک بنگلہ تھا۔ اسی میں سر نظام ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ جلدی
جلدی کشتی کھول رہا تھا تاکہ وہ جاکر اپنے بچّے کو لے آئے۔ وہ ابھی کشتی کھولنے میں مصروف
تھا کہ ایک صاحب اور میم صاحبہ آئے وہ فضلو سے بولے۔ "تم ہم کو دو دن
کے لئے یہ ہاؤس بوٹ دے دو۔"
صاحب یہ کرایہ دار کا نہیں ہے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔" فضلو
منّت سے بولا۔ "ہم کچھ نہیں جانتا ہم کو لے چلو!" وہ گرج کر بولے۔
وہ صاحب کے پیر پر گر پڑا۔ صاحب مجھے معاف رکھو میں مرجاؤں گا
میں اپنے بچّہ کو کیسے دیکھ سکوں گا۔"
میں اپنے بچّہ کو لینے جارہا ہوں۔ کل وہ چلے جائیں گے تو پھر میں اپنے
بچّہ کو کیسے دیکھ سکوں گا۔"
ان سب باتوں کا صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور ہٹ پر قائم
رہے۔ مجبورًا ملاح راضی ہو گیا۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا وہ خون
کے آنسو رو رہا تھا۔ دو دن کے بعد اس نے صاحب کو کنارے پر چھوڑا اور ڈاک
بنگلہ کی طرف بھاگا۔ وہاں کے باورچی سے معلوم ہوا کہ سر نظام کل ہی نکل گئے

وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُس اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ ناچار نامُراد گھر واپس آیا۔ اب وہ غم سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کے تن پر صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ بہت لاغر ہو گیا تھا۔ اب اُس کو صرف ایک آرزو تھی اور وہ وہ مرنے سے پہلے اپنے بچے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اس سے چھین لیا گیا تھا وہ چراغ سحری تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا اُس کی چراغِ زندگی کو بجھا سکتا تھا اُسے دِق ہو گئی تھی۔ خون تھوکتے تھوکتے وہ بالکل کمزور ہو گیا تھا۔ چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ وہ ہر وقت چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ انہی دنوں اسے خبر ملی کہ سر نظام سری نگر آئے ہوئے ہیں۔ اس کی محبت کے جذبہ نے مجبور کیا کہ وہ بچہ کو دیکھ آئے لیکن طاقت جواب دے چکی تھی اس لئے وہ مجبور ہو گیا۔ وہ پڑا پڑا موت کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا اندھیری راتیں بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ لوگوں نے دیکھا سر نظام اور لیڈی نظام اور اُن کے ساتھ ایک بچہ تھا جو کہ دو تین برس کا ہو گا۔ یہ لوگ فضلو کے دروازے پر کھڑے تھے۔ سر نظام نے کتنی ہی آوازیں دیں لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ لیڈی نظام نے بھی بہت کوشش کی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ آخر مجبور ہو کر سر نظام نے دروازہ کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلنے کے بعد انھوں نے کیا منظر دیکھا۔ اُس کی یاد سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ چارپائی پر بوڑھا ہڈیوں کا ڈھانچہ مُردہ پڑا تھا۔ جگہ جگہ خون کی قے پڑی ہوئی تھی۔ ایک جگہ تو پورے کلیجہ ہی کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر سر نظام اور لیڈی نظام کانپ گئے۔ لڑکا سر نظام سے ڈر کر چمٹ گیا۔ لیڈی نظام افسوس کرتے ہوئے بولیں۔ کاش ہم کچھ پہلے آجاتے۔ تاکہ وہ اپنے لڑکے کو بھی دیکھ سکتا ہم نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ اُس کی زندگی کے سہارے کو اس سے دور

رکھا۔ وہ اس غم کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس دُنیا سے چل بسا۔ بےچارے کی روح تڑپتی رہے گی۔ مرنے کے بعد بھی اُسے چین نہ ملے گا۔" سر نظام سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ بھی افسوس کر رہے تھے۔ لڑکا بولا "پاپا یہ کون؟" وہ بوڑھے کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"تمہارے پاپا ہیں" لیڈی نظام بولیں۔

"اُوں ہوں۔ ہمارے پاپا یہ ہیں" وہ سر نظام کی ٹانگوں سے چمٹ کر بولا۔ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ صرف وہاں پر بےکسی آنسو بہا رہی تھی۔

سرسوتی محل

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا۔ سورج پہاڑی کے دامن میں آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ سورج کی ہلکی شعاعوں میں پہاڑ پر کے شکستہ قلعہ کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ یہ قلعہ جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ چند شکاری نوجوان کندھوں پر بندوق رکھے قلعہ کی طرف جاتے نظر آئے۔ قلعہ کا پھاٹک بند دیکھ کر وہ لوگ ٹھہر گئے۔ اور ایک بوڑھی عورت کو دیکھ کر سب یک زبان ہو کر بولے "مائی رات ہو گئی ہے۔ ہمارے ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا اتنے بڑے قلعہ میں ہمیں رات بسر کرنے کے لئے کوئی کونہ مل سکے گا" بوڑھی عورت نے پھاٹک کے زنگ آلو بھاری بھرکم قفل۔ جو نہ جانے کس زمانہ کا ہوگا۔ کھولتے ہوئے کہا۔ بیٹا یہ قلعہ تو تمھیں لوگوں کا ہے۔ آؤ تمھارے لئے بہت جگہ ہے" سب لڑکے بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ وہ سب ایک باغ میں سے ہو تے ہوئے جس کی حالت بہت خراب تھی۔ روش شکستہ حال میں تھی۔ سنگِ مرمر کا فوارہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ باغ ایک ویران جنگل معلوم ہوتا تھا۔ جہاں پھول تھا نہ پھل۔ ایک برآمدہ میں پہنچے۔ درانڈے میں ایک چار پائی پڑی تھی۔ جس کا بان جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ شکاری نوجوان اپنی بندوق کو سنبھال اس پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے

ایک جوان نے بوڑھی سے کہا "مائی اگر کوئی کمرہ ہو تو دے دو۔ یہاں پر سردی بہت ہو رہی ہے ہم ٹھٹھر جائیں گے"

بوڑھی نے کہا "بیٹا تم یہاں تھوڑی دیر بیٹھو۔ میں ابھی کنجی لے کر آتی ہوں۔ پھر میں ایک کمرہ کھول دوں گی۔ تم اندر چلے جانا"

یہ کہہ کر بوڑھی چلی گئی۔ جواں انگڑائیاں لے کر تھکن دور کرنے لگے ان میں سے ایک نوجوان نے کہا "ارے یار مسعود ادھر تو آؤ۔ دیکھو تو۔ دیوار پر سنسکرت زبان میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ذرا پڑھو تو تم سنسکرت زبان سے اچھی طرح واقف ہو"

مسعود یہ سن کر آگے بڑھتا ہے۔ اور اپنی عینک ٹھیک کر کے پڑھتا ہے پھر یوں مخاطب ہوتا ہے۔ اس پر سرسوتی محل لکھا ہوا ہے شاید یہ قلعہ کا نام ہے

مرتضیٰ اچھل کر بولا "ارے یار جاوید یہ تو وہی قلعہ معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں شکیل کہہ رہا تھا۔ اور انور بھی تو ذکر کر رہا تھا۔ اس نے بھی تو سرسوتی محل بتایا تھا"

جاوید نے تھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کہا "مجھے تو یاد نہیں آتا"

شکیل نے انگڑائی لے کر کہا "بھئی تو تم بہت جلد بھول جاتے ہو۔ اس دن جب ٹھاکر صاحب کے لڑکے کھنہ کی سالگرہ تھی۔ جب ہی تو یہ ذکر ہوا تھا"

جاوید کوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے بولا "خوب رہی دوست آج تو قلعہ کی سیر کریں گے۔ میں نے قلعہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ آج اس بوڑھی عورت سے سب کچھ پوچھیں گے۔ یہ بڑھیا ضرور کچھ جانتی ہوگی"

مرتضیٰ نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا "سیر تو پھر ہو گی۔ یہاں تو

پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ یار سچ کہتا ہوں۔ صبح ایک ہی پراٹھا کھا کر چلا تھا۔"

"اور ہم نے کون بہت سا کھالیا تھا ہم نے بھی تو چند ڈبل روٹی پر گزارہ کیا تھا" مسعود نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

اتنے میں بوڑھی ایک چراغ اور کمبل کا گٹھا لے کر آئی۔ جاوید کچھ ہمت کر کے بولا "نانی ہمیں تو بھوک لگی ہے کھانے کو کچھ نہیں ملے گا؟"

بوڑھی عورت دروازہ کھول کر بولی "تم جب تک یہاں پر آرام کرو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں" بوڑھی عورت چلی گئی۔ سب لڑکے کمرے میں چلے گئے مرتضیٰ نے کہا "یار عورت تو بہت خلیق معلوم ہوتی ہے"

"میاں تو تم سب کے کیریکٹر ہی پر شک کرتے ہو" نسیم نے مسکرا کر کہا۔ سب قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ اسی وقت بوڑھی عورت ہاتھ میں سینی لیکر آتی ہے۔ اور لڑکوں کے سامنے رکھ کر کہتی ہے "بیٹا جو کچھ کھانا مجھ غریب کا تھا لا دیا تم کو تو اچھا نہ لگے گا"

شکیل نے کہا "مائی یہ کھانا تو ہمارے لئے متنجن سے کم نہیں ہے۔ ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں۔ تم نے ہمیں اپنے رہنے کو جگہ دی۔ ورنہ ہم سرد رات میں ٹھٹھر جاتے"

بوڑھی مسکرا کر بولی "شکریہ کس بات کا یہ تو انسان کا فرض ہے"

سب لڑکے بوڑھی عورت کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھتے ہیں اور کھانے پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں صاف کر دیتے ہیں بوڑھی برتن اٹھا کر چلی جاتی ہے۔ سب لڑکے غپ شپ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مرتضیٰ کچھ سوچ کر کہتا ہے "یارو وہ بوڑھی تو چلی

گئی۔ اب قلعہ کی سیر کیسے کرو گے؟"

"ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا" جاوید نے کہا۔

"دیکھو وہ بوڑھی آ رہی ہے" شکیل نے کہا۔ بوڑھی پاس آکر بولی۔ "بیٹا تمھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

جاوید نے کہا "نہیں مائی ہمیں کچھ ضرورت نہیں۔ اگر تم اس قلعہ کی سیر کرا دو تو بہت احسان ہوگا"

بوڑھی مسکرا کر بولی "احسان کی کیا بات ہے۔ ضرور سیر کرو۔ یہ محل کتنا اچھا ہے۔ یہ تو اندر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا"

"قلعہ نہیں ہے؟" جاوید نے تعجب سے کہا۔

بوڑھی نے کہا "کبھی یہ قلعہ تھا پھر محل ہو گیا۔ اب یہ سرسوتی محل ہے"

لڑکے آپس میں سرگوشی کرنے لگے۔ بوڑھی عورت دروازہ کھولتی ہے۔ دروازہ کھلنے پر ایک بڑا کمرہ نظر آتا ہے جس میں بہت سے روشندان رہتے ہیں۔ بوڑھی چراغ سے کمرہ کی ہر ایک شے دکھاتی ہے۔ دیوار پر جگہ جگہ قیمتی پتھر جڑے رہتے ہیں۔ کمرہ جگمگاتا رہتا ہے۔ کمرہ کے وسط میں سنگِ مرمر کا چبوترہ رہتا ہے جس پر چڑھنے کے لئے تین سیڑھیاں رہتی ہیں۔ سیڑھیوں پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے اترے رہتے ہیں۔ کمرہ کی دیواروں پر پرانے زمانے کی تصویریں نقش رہتی ہیں۔ کسی تصویر میں بادشاہ گھوڑے پر سوار تیر کا شکار کرتا رہتا ہے۔ کسی تصویر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مہاراجہ تخت پر بیٹھے ہیں۔ اور مہارانی پشت پر کھڑی رہتی ہیں۔ ایک تصویر جاوید کو بہت پسند آئی۔ اس تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ایک جنگل بیابان ہے طوفان آیا ہوا ہے۔ دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ ایک بادشاہ

خستہ حال ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔اس کی نگاہیں مغرب کی طرف ہیں مغرب کی جانب اُس کا گھوڑا دوڑا جا رہا ہے۔ اِس تصویر کو دیکھ کر جاوید مرتضیٰ کو کہنی مار کر کہتا ہے "یار دیکھو تو کِس قدر عمدہ تصویر ہے"

مرتضیٰ ہنس کر کہتا ہے یار تمہیں خبط تو نہیں ہو گیا ہے۔ اِس تصویر میں کیا رکھا ہے"

جاوید مُنھ بنا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد یہ لوگ ایک گول کمرہ میں جاتے ہیں جس میں سفید قیمتی پتھر جڑے رہتے ہیں۔ اس کمرہ کی ہر ایک چیز سفید رہتی ہے حتیٰ کہ اس کی چھت بھی سفید رہتی ہے۔ غرض یہ لوگ قلعہ کا سیر کرتے ہوئے بارہ دری میں پہنچتے ہیں۔ مسعود جمائی لے کر کہتا ہے۔ جاوید کچھ نئی بات تو قلعہ میں نظر نہیں آئی۔ سب ایک قلعہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا قلعہ خوبصورت ہے"

جاوید ہلکی سی انگڑائی لے کر کہتا ہے۔ ہاں سچ تو کہتے ہو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ اِتنی دیر آرام کر لیتے۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ ہڈیوں تک میں درد ہو رہا ہے"

شکیل جو بارہ دری میں اُجڑے ہوئے جھاڑوں کو چین پر چاندنی رقص کر رہی تھی۔ دیکھ رہا تھا۔ وہ جاوید اور مرتضیٰ کو پیچھے دیکھ کر کہتا ہے اجی جناب! آؤ بھی جلدی سے سیر کر لیں پھر آرام سے سوئیں"

یہ سب بارہ دری میں سے ہوتے ہوئے ایک مندر کے پاس پہنچے ہیں۔ مندر کو دیکھ کر شکیل کہتا ہے "مائی ہم مندر کے اندر نہیں جا سکتے ہیں خیر کوئی بات نہیں ہے۔ مندر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف بھگوان مورتی ہے اور وہاں چند تصویریں بھی ہیں تم دیکھو مندر کے دروازے کے

پاس پہنچ کر بولی۔

جاوید مندر کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولا" آؤ بھئی۔ دوست اتنی سیر کرلی۔ اب مندر کو کیوں چھوڑیں؟"

نسیم ناک بھوں چڑھا کر بولا" بھئی میں یہ بُت پرستوں کے مندر میں نہیں جاؤں گا۔"

مسعود نے بھی اس کی تائید کی۔ اس پر سب لڑکے چل گئے۔ مرتضیٰ تھوڑی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا" بھئی یہ دونوں تو پکے مُلا ہیں۔"

سب لڑکے مندر میں داخل ہوئے۔ بوڑھی چراغ سے مندر کی ہر ایک چیز دکھانے لگی۔ لڑکے مندر کی آویزاں تصویروں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے لگے۔ کیونکہ یہ تصویریں اُن کے بھگوان اور کرشن رادھا کی تھیں۔ مندر کے عین بیچ میں ایک بڑی تصویر آویزاں رہتی ہے۔ تصویر کے چوکھٹوں پر سنہرے نقش و نگار رہتے ہیں۔ بوڑھی تصویر کے پاس، چراغ کرتی ہے۔ تصویر صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اِس تصویر کو دیکھ کر جاوید اچھل پڑتا ہے اور کہتا ہے" ارے بھئی مرتضیٰ شکیل اِدھر تو آؤ۔ یہ رہی نادر شے۔"

سب لڑکے دوڑے دوڑے آتے ہیں۔ شکیل ہنس کر کہتا ہے "

"جاوید میاں ایسی کون سی شے ہے جو آپ خوشی سے دیوانے ہو رہے ہیں؟"

"ارے یار! طعنہ دینا چھوڑ دو۔ یہ تصویر دیکھو۔" جاوید تصویروں کو دکھاتے ہوئے بولا" یہ تصویر ایک خوبصورت عورت کی ہے۔ اِس کی رسیلی آنکھیں لوگوں کو مخمور کرنے کو کافی تھیں۔ اِس کی گندمی رنگت چراغ کی روشنی میں دمک رہی ہے۔ گھونگریالے بالوں کی لٹیں جو ناگن سے مشابہ تھیں، بل کھاتی ہوئی

شانوں پر پڑی تھیں۔ باریک ساری شانوں پڑی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ اُس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ اور صراحی دار گردن صاف نظر آ رہی تھی۔

گردن میں موتیوں کا کنٹھا حمائل تھا۔ اُس کے حسین ہاتھ مَرمَریں انگلیاں پھول جیسے رُخساروں کو چھو رہی تھیں۔ یہ تصویر ایک زندہ مجسمہ کی مشابہ تھی۔ سب لڑکے یک زبان ہو کر بولے۔ "سبحان اللہ کیا حُسن ہے" آنکھیں چکا چوند ہو رہی ہیں۔ آج تک ایسا حُسن نہیں دیکھا۔"

سب لڑکے تصویر کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ جاوید نے تصویر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اس کی آنکھیں کیا ہیں شراب کے چھلکتے پیالے ہیں۔" تو پی لو نا زاہد خشک کیوں بنے ہوئے ہو۔"

اجی میاں! طعنہ کیا کس رہے ہو۔ ذرا آ کر دیکھو کس قدر حسین ہے یہ تصویر۔" جاوید نے منھ بنا کر کہا۔

شکیل اپنی رائے قائم کرتے ہوئے بولا۔ "اس کے یاقوتی لب تو لعلِ احمریں ہیں۔"

نسیم اپنی باریک آواز سے داد دیتے ہوئے بولے۔ "اے واہ اس کی کمر کتنی پتلی ہے۔ انگور کی لچکتی ہوئی شاخ معلوم ہوتی ہے۔"

نسیم کی بات سُنکر سب لڑکے قہقہہ لگا کر ہنسے اور نسیم شرمندہ ہو گیا۔ جاوید ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "اِن کو تو سب کمر ہی پتلی نظر آتی ہے کیونکہ خود پتلی کمر والے ہیں۔"

یہ سُنکر لڑکے پھر ہنسے۔ اور نسیم شرمندہ ہو گیا۔ جاوید بوڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مائی یہ کس کی تصویر ہے۔"

بوڑھی یہ سُنکر چونک پڑی۔ وہ تصویر کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ پُرنم آنکھوں کو جھکا کر بولی "رانی سرسوتی"۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں کا چراغ ہوا کے جھونکوں سے ٹمٹما رہا تھا۔ وہ بہت غمگین معلوم ہوتی تھی۔ شکیل نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مائی تم غمگین کیوں ہو گئیں"۔

وہ بناوٹی تبسم ہونٹوں پر لاکر بولی "نہیں تو بیٹا"۔

نسیم نے کہا "ضرور کوئی بات ہے۔ آپ تصویر دیکھ کر آنکھوں میں آنسو کیوں لے آئیں"۔ بوڑھی عورت نے ٹالنے کی غرض سے کہا "کسی کے معاملہ میں دخل دیا نہ کرو"۔

جاوید چبوترہ پر بیٹھ گیا۔ اور گلاب کی جھاڑی میں سے ایک پتی توڑ کر ملنے لگا۔ اُس کی نگاہیں بوڑھی کے چہرہ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کسی اہم مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف ہے۔ مرتضیٰ اس کے شانے ہلاتے ہوئے بولا "شاہ کیا سوچ رہے ہو۔ چلو آرام کریں گے"۔

آرام پھر کرلیں گے۔ میں تو بوڑھی سے اِس بات کا سبب ضرور پوچھوں گا"۔

اور وہ اگر نہ بتائے۔ مرتضیٰ چڑ کر بولا۔

بتائے گی کیوں نہیں۔ جاوید اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ بوڑھی کے پاس جاکر جو کہ مندر کے پاس چراغ لئے کھڑی تھی یوں مخاطب ہوا۔ "مائی کچھ تو کہو"۔

میں اپنا راز کسی سے نہیں کہنا چاہتی"۔ وہ چین بجبین ہو کر بولی۔

شکیل نے کہا۔ "مائی ہم پر بھروسہ کرو۔ ہم تمھارا راز اپنے سینے میں رکھیں گے"۔

بوڑھی مندر کی چوکھٹ پر بیٹھ کر بولی۔ "میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں سنوگے میرا دکھڑا تمہارا عزیز وقت ضائع ہوگا۔"

جاوید نے منت سے کہا آپ اپنا حال کہیئے ہمیں اعتراض نہیں ہے۔"

بوڑھی کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں وہ تصویر جو تم نے دیکھی ہے۔ رانی سرسوتی کی تصویر ہے۔ وہ راجہ کرن کی چہیتی رانی تھی۔ وہ اُسے اپنی تمام رانیوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ اور اُسی کے نام پر اِس قلعہ کا نام "سرسوتی محل" رکھا تھا۔ تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ رانی سرسوتی میری لڑکی تھی۔ لیکن تعجب نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اگر مہاراجہ کی رانی ہوتی تو کچھ تعجب نہ تھا۔ میں ایک غریب کہارن ہوں۔ سرسوتی کا باپ جب سرسوتی پیدا بھی نہ ہوئی تھی وہ مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا میں نے سرسوتی کی پرورش بڑی محنت سے کی تھی۔ میں اُسے اپنی آنکھوں کا نور سمجھتی تھی۔ میں اُس کی حفاظت ایک پھول کی مانند کرتی تھی۔ مجھے اُس سے والہانہ محبت تھی۔ محبت بھی کیوں نہ ہوتی۔ وہ اتنی پیاری بچی تھی کہ ہر ایک اُس سے پیار کرتا تھا۔ میں چکی پیستی اور لکڑیاں بھی چُنتی لیکن سرسوتی سے کچھ کام نہ لیتی۔ وہ مجھ سے کہتی۔ "ماں اب تو کام نہ کر میں بڑی ہوگئی ہوں سب کچھ کر لیا کروں گی۔"

میں اُسے بہلاتے ہوئے کہتی۔ "بیٹی جب تک میں زندہ ہوں تجھ سے کام نہ لوں گی۔ میرے بعد تو تیرے لئے کام ہی کام ہے۔ وہ میری یہ بات سُن کر خاموش ہوجاتی۔ اِسی طرح دُکھ درد میں پرورش پاکر سرسوتی چودہ برس کی ہوگئی۔ میری سرسوتی بڑی سُندر تھی۔ سارا گاؤں۔ اُس کی خوبصورتی پر رشک کرتا تھا۔ وہ جس دن نہا کر معمولی کپڑے پہن لیتی تو اُس دن اُسے نظر لگ جانے

کا ڈر تھا سرسوتی کی شادی کے کئی جگہ سے پیام آئے لیکن میں نے ٹال دیا میرا ارادہ تھا کہ سرسوتی کی شادی کسی امیر سے کروں۔ کیونکہ سرسوتی نے ابھی تک غریبی میں پرورش پائی ہے اور اس نے دنیا کا عیش و آرام نہیں دیکھا۔ اگر میں اس کی شادی کسی غریب سے کر دوں گی تو وہ پھر مصیبت میں پھنس جائیگی۔ ایکدفعہ میں گھاس کا گٹھا لیکر گھر آئی۔ سرسوتی روٹی پکا رہی تھی۔ دیکھکر وہ بولی "ماں تو بہت تھک گئی ہے۔ اب آرام کر یہ گٹھا میں بیچ آؤں"

"بیٹی تیرے باہر جانے میں خطرہ ہے" میں نے گھبرا کر کہا۔

ماں میں تیرا مطلب نہیں سمجھی" وہ ہاتھ دھوکر بولی۔ میں نے اس کو پیار کرتے ہوئے کہا "یہ چاند سی صورت لکڑیاں بیچنے کے لائق نہیں" وہ مسکرا پڑی۔ میں نے لکڑیوں کا گٹھا اٹھا کر کہا "اچھا اب میں لکڑیاں بیچنے جاتی ہوں تو کہیں باہر نہ جانا"

اس کے بعد میں چلی گئی۔ لیکن اس نے میرے منع کرنے کے باوجود گھڑا لے کر پانی بھرنے چلی گئی۔ ان ہی دنوں راجہ کرن شکار کے لئے ہمارے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ وہ کسی ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں نکل آئے۔ جہاں میری سرسوتی پانی بھر رہی تھی۔ وہ میری سرسوتی سے بولے "لڑکی مجھے پانی پلا دو"

میری بھولی بھالی سرسوتی نے کہا "تم اتنے امیر ہوکر بھی پن گھٹ پر پانی پینے آتے ہو" راجہ بولے "مجھے پن گھٹ پر پانی پینے کی عادت ہے۔ لاؤ مجھے چلو ہی سے پانی پلا دو"

سرسوتی نے چلو سے راجہ کو پانی پلادیا میری سرسوتی کو کیا معلوم کہ یہ راجہ کرن ہیں۔ پھر راجہ نے کہا "لڑکی تیرے پتا کہاں ہیں"

میری سرسوتی نے کہا "میرے پتا آکاش پر رہتے ہیں وہ سورگ کے جمعدار ہیں" راجہ یہ سنکر خوب ہنسے۔ وہ بولے "تجھے کیسے معلوم ہوا"

"میری ماں کہتی ہے" سرسوتی بولی۔ راجہ نے کچھ نہ کہا۔ اور ایک قیمتی انگوٹھی سرسوتی کو دے کر چلے گئے۔ جب میں شام کو آئی تو سرسوتی نے سارا قصہ سنایا میں بہت خوش ہوئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا کہ سرسوتی کی قسمت جاگ اُٹھی۔ میں راجہ کرن کو کوئی امیر سمجھے ہوئے تھی۔ دوسرے دن میں ساگ بنا رہی تھی کہ ایک سنتری آیا وہ مجھ سے بولا "سرسوتی کی ماں کہاں ہے"

میں نے کہا "میں ہوں سرسوتی کی ماں"

"تمہیں راجہ کرن نے بلوایا ہے" وہ بولا۔ میں بہت گھبرائی سرسوتی نے مجھ سے کہا "راجہ نے بلوایا ہے تو چلی جاؤ۔ راجہ بہت اچھے ہیں وہ تجھے فضول سزا نہ دیں گے" میں نے سنتری سے کہا "بھیا مجھ سے ایسا کونسا قصور ہوا ہے مجھے دربار میں بلایا جا رہا ہے؟ میں چور نہیں ہوں یہ انگوٹھی ہم نے چرائی نہیں بلکہ ایک امیر آدمی دے گیا ہے" میں نے راجہ کرن کی انگوٹھی سنتری کو دکھائی۔

سنتری کڑک کر بولا "بادشاہ کا حکم ہے میں کچھ نہیں جانتا۔ جلدی چل"

میں روتی ہوئی سرسوتی سے گلے ملی۔ اُس کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے روتے ہوئے کہا "بیٹی اب نہ جانے کیا ہو۔ اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو صبر کر لیجیو۔ اور سندر چاچا کے یہاں چلی جانا"

سرسوتی روتی رہی۔ اور میں سنتری کے ساتھ ہولی جبتک گاؤں نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ مجھے وہ لوگ رتھ پر بٹھا کر لے جا رہے تھے چار سنتری میرے ساتھ رتھ میں تھے۔ میں اُن سے منت خوشامد کرتی رہی کہ مجھے وہاں نہ لے چلو۔ اور میں ثبوت کے طور پر وہ انگوٹھی دینے لگی جو راجہ کرن سرسوتی کو دی تھی۔ سنتری انگوٹھی دیکھ کر بہت غصہ ہوا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا "چور کہیں کی۔ مہاراجہ کی انگوٹھی چرالی اور اب مجھے دے رہی ہے کہ میں پکڑا جاؤں"

میں یہ سن کر کانپ گئی۔ میں نے روتے ہوئے کہا: "مجھے کیا معلوم یہ راجہ صاحب کی انگوٹھی ہے۔ ورنہ نہ لیتی۔ یہ انگوٹھی مجھے ایک امیر آدمی نے دی ہے اُسی نے یہ انگوٹھی چرائی ہوگی۔"

یہ سن کر سنتری مجھے تلوار دکھا کر بولا کہ اگر گریہ و زاری کی تو اِس تلوار سے خاتمہ کر دوں گا۔ میں یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ میری زبان تو خاموش تھی لیکن آنسو نہ تھمتے تھے۔ میں سرتی کے خیال سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اور یہ سوچ کر کہ اُسے اب دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ دل بھر آتا اور آنسو بے اختیار بہنے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد رتھ ایک عالیشان محل کی ڈیوڑھی پر جا کر رک گیا۔ سنتری نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں اتر پڑی۔ اور اپنی چھوٹی سی چادر جو جا بجا سے پھٹی ہوئی تھی خوب اچھی طرح اوڑھ لی۔ ڈیوڑھی پر زرق برق لباس پہنے ایک باندی کھڑی تھی۔ سنتری نے اُسے اشارہ کیا۔ وہ باندی میرے پاس آئی اور پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں برآمدہ میں سے ہوتی ہوئی ایک کمرہ میں پہنچی۔ جہاں بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور باریک پردے پڑے ہوئے تھے۔ فرش اتنا چکنا تھا کہ پیر پھسلتا تھا۔ میں ایک دفعہ گرتے گرتے بچی۔ اسی کمرہ کے وسط میں ایک نہایت خوبصورت چھپر کھٹ تھا۔ جس پر کمخواب اور اطلس کے گدے تھے اس چھپر کھٹ پر ایک حسین لڑکی جس کی عمر بمشکل سولہ برس کی ہوگی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ راجہ کرن کی بھتیجی رانی کنچن مالا تھی۔ یہ زرین لباس پہنے ہوئے تھی۔ ہیرے جواہر کے زیورات اس نے پہن رکھے تھے۔ وہ پیر کو ایک سونے کی چوکی پر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کے مرمریں پاؤں میں پائل تھے۔ کئی لونڈیاں جو زرین لباس پہنے تھیں مورچھل کر رہی تھیں۔ باندی نے ایک فرشی سلام کیا۔ اور رانی کے پیروں پر جھک گئی۔ میں بھی باندی کی نقل کر کے فرش پر اتنا جھکی کہ ناک چوکی سے ٹکرا گئی۔ پھر میں نے رانی صاحبہ کے نازک پاؤں چھوئے۔ رانی صاحبہ مسکرائیں۔ میں قالین الٹ کر فرش پر بیٹھ گئی

جس پر ایک نقرئی قہقہہ پڑا میں گھبرا گئی کہ یہ کیوں ہنس رہی ہیں۔ یہ نہ سمجھ سکی کہ میری جہالت پر ہنس رہی ہیں۔ رانی نے ایک باندی سے کچھ کہا۔ اس باندی نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے ہولی۔ وہ بارہ دری میں سے ہوتی ہوئی ایک لنگر خانہ کے پاس پہنچی۔ جہاں پر بہت سے غریب آدمیوں کو کھانا دیا جارہا تھا۔ باندی نے یہاں پر مجھے چھوڑ دیا اور چلی گئی میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں بہت تھک گئی تھی کیونکہ بہت دیر سے ادھر ادھر نچائی جارہی تھی۔ لنگر خانہ کے داروغہ نے مجھے کھانا دیا۔ مجھے بھوک نہ تھی اس لئے وہ کھانا میں نے ایک غریب کو دیدیا تھوڑی دیر بعد سب چلے گئے۔ اور داروغہ بھی چلا گیا۔ میں بالکل تنہا رہ گئی۔ دوپہر ہو چلی تھی، دھوپ بہت تیز ہو رہی تھی سورج دیوتا اپنی لال لال آنکھیں نکالے دنیا والوں کو گھور رہے تھے۔ میں گرمی سے پسینہ پسینہ ہوگئی اور دھوپ کی شدت سے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ میں دھوپ سے بچنے کے لئے پاس کے اصطبل میں گھس گئی۔ ابھی میں ٹھیک طرح سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ ایک کابلی گھوڑے نے اس زور سے دولتی لگائی کہ میں ہائے کر کے رہ گئی۔ اتنے میں سائیس آگیا۔ اور اس نے مجھے بچالیا۔ وہ مجھ سے ڈانٹ کر بولا "بڑھیا تجھے معلوم نہیں کہ یہ اصطبل ہے"

"بھیا مجھے معلوم نہ تھا" میں منت سے بولی۔ اُسے میری حالت پر رحم آگیا۔ اور اُس نے مجھے ایک سائبان میں چھوڑ دیا۔ میں ستون سے ٹک کر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر میں مجھے نیند آگئی۔ اور ایسی بے خبر سوئی کہ جب کسی نے جھنجھوڑا تب میری آنکھ کھلی۔ دیکھا شام ہو چکی تھی سورج دیوتا اپنی ماں کی گود میں سوتے جارہے تھے اس آدمی نے مجھے بارہ دری میں جانے کو کہا میں وہاں پہنچی بارہ دری میں ایک خوش پوش عورت کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے ہولی اُس نے مجھے ایک بڑے سے کمرہ میں لاکر چھوڑ دیا۔ یہ کمرہ بہت آراستہ تھا سونے

چاندی کی چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک چوکی پر راجہ براجمان تھے وہ سادہ قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے گلے میں موتیوں کا کنٹھا تھا۔ باندی نے راجہ کے پیر چھوئے۔ اور وہاں سے چلی گئی۔ میں نے بھی راجہ جی کے پیر چھوئے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ اس وقت راجہ کمرہ میں اکیلے تھے۔ وہ چوکی پر پیر پھیلائے پڑے تھے۔ ایک خوبصورت عورت ان کو مورچھل کر رہی تھی۔ انھوں نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا وہ چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد راجہ نے مجھے بیٹھنے کو کہا میں قالین پر بیٹھ گئی۔ راجہ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "کیوں مائی تمھارا پتی سورگ کا جمعدار ہے"؟

میں جھینپ گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "نہیں راجہ جی"۔ یہ سُنکر وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ وہ چوکی پر پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ "تمہاری بیٹی تو کہتی تھی اب مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ امیر آدمی نہ تھا بلکہ خود راجہ کرن تھے راجہ کرن مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے۔ "ہم تمھاری لڑکی سے بیاہ کریں گے"۔

میں حیرت سے راجہ کا مُنہ تکنے لگی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ سچ ہے بلکہ میں سمجھ رہی تھی کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ راجہ نے پھر یہی سوال کیا۔

میں بولی "مہاراج ہم آپ کی پرجا ہیں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ دخل دیں"۔

یہ سُن کر راجہ ہنسے اور تھوڑی دیر تک خلا میں گھورتے رہے۔ پھر وہ بولے "ڈرو نہیں۔ تمھاری سرسوتی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہم تمھاری بیٹی پر مہربان ہیں ہم اُسے سب مہارانیوں سے زیادہ آرام سے رکھیں گے۔ ہماری محبت مہارانی کنچن مالا کے لئے بہت ہے لیکن وہ کنچن مالا سے بھی بڑھکر رہے گی"۔ اتنا کہہ کر انہوں نے گھنٹی بجائی ایک باندی آموجود ہوئی راجہ نے باندی سے کہا "انھیں ان کے

گھر پہنچا دو۔"

میں نے راجہ کو فرشی سلام کیا اور اُن کے پیر چھو کر باہر چلی آئی میں آج بہت خوش تھی۔ مجھے سرسوتی رانی بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجھے جب ہی ہوش آیا جب کہ سنتری نے ڈانٹ کر کہا "چل جلدی رتھ میں بیٹھ" یہ ہی سنتری تھا جو مجھے تلوار دکھا کر ڈرا رہا تھا میں رتھ میں بیٹھ گئی رات کے سات آٹھ بجے ہمارا رتھ گاؤں میں پہنچ گیا میں رتھ سے اتر کر سیدھی اپنے گھر کی طرف بھاگی سرسوتی گھر کے باہر بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی میں نے اسے بہت پیار کیا وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر بولی "ماں تو آ گئی اب مجھے چھوڑ کر مت جانا" میں نے سرسوتی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "میں اپنی سرسوتی کو اکیلی نہ چھوڑوں گی۔ وہ خوش ہو گئی اور ہم دونوں جھونپڑی کے اندر آ گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹیوں نے کھانا کھایا۔ سرسوتی تو سو گئی لیکن مجھے نیند نہیں آئی آج میں خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ رات بھر نئے نئے خیالات آتے رہے۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔ سرسوتی اپنے کام میں مصروف ہو گئی وہ بھاجی کاٹ رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر بولی "سرسوتی اب تجھے بھاجی نہ کاٹنی پڑے گی۔ اب تو راجہ کرن کی رانی بنے گی"

وہ شرما کر بولی "تم بھی کیا بہکی بہکی باتیں کرتی ہو"

"میں سچ کہہ رہی ہوں" میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ میں اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا "کچھ تو بول۔ تجھے یہ سن کر خوشی نہیں ہوتی"

خوشی کا ہے کو ہو گی میں تو راجہ کرن سے شادی نہیں کروں گی۔ راجہ کا کیا ٹھکانا کبھی اس پر مہربان ہیں کبھی اس پر فریفتہ" وہ بگڑ کر بولی۔

میں نے کہا "سرسوتی یہ کیا بک رہی ہے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے

وہ مجھے خوش رکھیں گے۔"

"وہ خوش رکھیں گے لیکن میں تو خوش نہ رہوں گی۔ ہم غریب ہی اچھے ہیں کہ کسی کے دل کو ٹھیس نہیں لگاتے۔ یہ امیر اپنی دولت کے مان میں سب کو اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ ان کو مجھ سے شادی کرنے کا کیا حق ہے" سرسوتی غصہ سے بولی۔

میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹی تجھے ایسا نہ کہنا چاہیئے۔ میں نے اُن سے وعدہ کر لیا ہے۔ اگر انکار کر دا ں گی تو وہ اپنے کو برباد کر دیں گے۔ کیا میں نے تجھے اسی دن کے [illegible] پوسا ہے کہ تو میرا ایک حکم نہ مانے"۔ اس کے آگے میں نے کچھ نہ کہا۔

اُس نے [illegible] کے اندر [illegible] سرسوتی کو دیکھا اور بولی۔ "ماں میں تیرے [illegible] ہوں۔ اگر تو میری بات نہ مانے گی تو [illegible] ہے۔ مجھے تیری خاطر سب کچھ منظور ہے۔ [illegible] ماں [illegible] کبھی نہ رہ سکوں گی تم ہی سوچ [illegible] سکتی ہے [illegible]" کہہ کر وہ رونے لگی [illegible] گلے سے لگا لیا [illegible] راجہ کے یہاں سے بلاوا آیا۔ میں سرسوتی [illegible] سرسوتی کی شادی راجہ کرن سے ہو گئی۔ شادی کے دن بھی سرسوتی مجھ سے ناراض تھی۔ جب شادی کا وقت آیا اس نے مجھے پاس بلایا اور کہا "ماں مجھے بھول نہ جانا کبھی کبھی مجھے دیکھنے آ جایا کرنا۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔ میں نے اس کو تسلی دی۔ راجہ کرن کی طرف سے مجھے وظیفہ ملنے لگا۔ اور میں اپنے گاؤں میں آرام سے رہنے لگی۔ میری سرسوتی کی شادی کو ایک مہینہ ہو گیا تھا اس دوران میں میں سرسوتی کو دیکھنے نہیں گئی تھی صبح کا وقت تھا میں بیٹھی ہوئی پوجا کر رہی تھی۔ کہ ایک راجہ کے یہاں کا نوکر آیا اس نے مجھ سے آکر کہا "رانی سرسوتی نے تمھیں بلایا ہے۔"

میں اسی وقت جانے کو تیار ہو گئی۔ جب میں محل میں پہنچی تو کنچن مالا باہر برآمدہ میں کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ غصہ سے لال تھا وہ بڑبڑا رہی تھی "یہ کہارن کی بچی مہاراجہ کو اتنی پیاری ہو گئی کہ مجھ سے ملنا تک گوارا نہیں کرتے۔ اس کو راجہ کی نظروں میں ذلیل نہ کراؤں تو میرا نام کنچن مالا نہیں۔" وہ چلائی میں یہ سُن کر کانپ گئی اور سیدھے سرسوتی کے کمرہ میں گئی۔ سرسوتی چھپرکھٹ میں پڑی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھی اور آنسو پونچھنے لگی۔ میں نے اُس کا اداس چہرہ دیکھ کر کہا "خوش تو ہو بیٹا۔"

"ہاں بہت خوش ہوں۔" وہ بناوٹی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولی۔

"لیکن تم تو اداس دکھائی دے رہی ہو۔" میں نے اُس کے نمکین چہرہ کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ وہ طعنہ سے بولی "اداس کیوں ہوں گی اتنا بڑا محل یہ قیمتی زیور اتنے سارے نوکر ملنے پر بھی میں اداس ہوں گی۔ تمہارے خیال سے میں یہ چیزیں پا کر بہت خوش ہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم مالا یہ چیزیں میری آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی ہیں۔ رات کو میں سوتی نہیں بلکہ کروٹیں بدلنے میں گزار دیتی ہوں۔" سوتیا ڈاہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کنچن مالا میری دشمن ہے اس کے ہر وقت کے زہر میں بجھے ہوئے طعنے مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگی میں نے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "راجہ تو تم پر مہربان ہو گئے۔ تم ان سے شکایت کیوں نہیں کرتیں۔"

"مجھے چغلی کھانے کی عادت نہیں۔ راجہ تو مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن ان سے بھی میرے خلاف شکایتیں کی جا رہی ہیں۔ وہ بھی انسان ہیں کب تک سنیں گے ایک نہ ایک دن وہ مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے پتی کی بے رخی مجھ سے نہ دیکھی جائے گی جس دن وہ مجھ سے ناراض ہوں گے میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔" سرسوتی غصہ سے بولی۔

لیکن کیچن مالا کو تم علیٰحدہ بھی تو کر سکتی ہو۔" میں رائے قائم کرتے ہوئے کہا۔ وہ تمکنت سے بولی۔"لیکن میں یہ کرنا نہیں چاہتی۔ کسی کا سکھ چین میں اپنے لئے برباد کروں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔"

"لیکن تم کیچن کی بھلائی کیوں چاہتی ہو وہ تو تمھاری دشمن ہے" میں غصہ سے بولی۔

اس نے اسی انداز سے کہا۔" وہ میری دشمن ہی سہی۔ لیکن میں تو اس کی دشمن نہیں ہوں۔ ماں تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم نے بھگوان کا پرچار نہیں سنا کہ دشمن کو بھی دوست سمجھو۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اسی وقت ایک باندی داخل ہوئی۔ سرسوتی باندی سے مخاطب ہو کر بولی "کیا ہے نرملا!"

راجہ جی آپ کو یاد کر رہے ہیں۔" وہ جاتے ہوئے بولی۔ سرسوتی یہ سنکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور مجھ سے بولی" ماں اب جاتی ہوں۔ کبھی کبھی تو تم آجایا کرو۔" وہ مجھ سے رخصت ہو کر چلدی۔ میں گھر چلی آئی پندرہ دن ہو گئے مجھے سرسوتی کی یاد ستانے لگی۔ میں اس سے ملنے کے لئے جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اسی وقت سنتری آیا۔ یہ سنتری سرسوتی کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا اور سرسوتی کا رازدار تھا۔ اس کو اداس دیکھ کر میں بولی۔" کہو سنتری جی کیا خبر ہے۔ میری سرسوتی کیسی ہے؟"

"وہ تو سورگ کو سدھاریں۔" سنتری کے آنسو نکل آئے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے چلا کر کہا۔ میرا کلیجہ یہ خبر سُن کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

سنتری بولا۔" میں سچ کہہ رہا ہوں اُس دن جب تم چلی گئیں تو کیچن مالا نے سرسوتی کے خلاف یہ الزام لگایا کہ وہ ایک چرواہے سے محبت کرتی ہے۔ راجہ کرن یہ سنکر غصہ ہوئے ان کو یقین نہ آیا اور انھوں نے سرسوتی سے کچھ نہ کہا

اُن کو یقین دلانے کے لئے کنچن مالانے ایک چال چلی۔ اُس نے ایک چپرواسے کو راضی کر لیا۔ ایک رات سرسوتی اپنے کمرہ میں سو رہی تھی۔ اسی وقت چپرواسے کو اس کے کمرہ میں کنچن نے بھجوا دیا۔ اور مہاراجہ کو بلوا کر دکھایا۔ کہ دیکھو وہ چپرواسے کو اپنے خاص کمرہ میں بلواتی ہے۔ یہ دیکھ کر مہاراجہ بہت غصہ ہوئے۔ دوسرے دن وہ سرسوتی پر بہت خفا ہوئے۔ سرسوتی نے اپنی بے گناہی کا اقرار کیا۔ لیکن وہ نہ مانے انھوں نے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اُس دن سے وہ اُس سے ناراض رہنے لگے۔ اُن کی ناراضگی سرسوتی کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ ان کے غم میں اسنے آج زہر کھا لیا۔ اور اس دُنیا سے چل بسی۔" میں نے یہ سُنکر ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔ دو دن کے بعد ہوش آیا۔ اُس وقت سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ میں محل میں نہ گئی۔ راجہ کرن نے کتنی ہی دفعہ بُلوایا۔ یہ سب میرے کیئے کی سزا تھی۔ سرسوتی انکار کرتی رہی۔ لیکن میں نے دھن دولت کے خیال سے اندھی ہو کر اپنی لڑکی نرک میں ڈھکیل دیا۔" اتنا کہہ کر بوڑھی خاموش ہوگئی۔ اس کے پچکے ہوئے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ قصہ سُن کر سب لڑکے متاثر ہوئے۔

جاوید بولا "بہت پُر درد قصہ ہے۔ ہم نہ سمجھتے تھے کہ اس محل کے بارے میں ایک کہانی بھی پنہاں ہے"۔

"واقعی بہت پُر درد قصہ ہے" شکیل نے جاوید کی تائید کی پھر یہ سب لڑکے کمرے میں آ گئے۔ بوڑھی اپنی کُٹیا میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک یہ لڑکے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر سو گئے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ اور اس کی چمک میں "سرسوتی محل" صاف نظر آ رہا تھا۔

محبت

میں افسانہ نویس ہوں۔ اور ایک مشہور افسانہ نگار۔ میری شہرت بہت ہے میرے افسانے اور ناول اُردو ادب کے روحِ رواں ہیں۔ مجھے بچپن ہی سے افسانہ نگاری سے دلچسپی تھی۔ میں جو کچھ لکھتا تھا قلم برداشتہ نہیں۔ بلکہ کسی خیال سے متاثر ہو کر اسی وجہ سے میرے افسانے اور مقبول ہوتے تھے۔ میری بچپن کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج میں مشہور مصنف ہوں۔ میں نے بچپن میں کئی افسانے لکھے جو زیادہ مقبول نہیں ہوئے لیکن جب میں سنِ تمیز کو پہنچا تو افسانے میرے ادب کی سوسائٹی کی جان ہو گئے۔ میرے والد محترم کا خیال ہے کہ میں ایک ناکارہ لڑکا ہوں۔ اُن کی نظروں میں افسانہ نویسی ایک واہیات شغل ہے اُن کا فرمانا ہے کہ جسے دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا وہ افسانہ نویسی اختیار کر لیتا ہے اسی خیال کی رو سے وہ مجھے بیکار انسان سمجھتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ میں لکھ پڑھ کر مشہور بیرسٹر بنوں۔ لیکن اس کے برخلاف میں بی اے کر کے ایڈیٹر ہو گیا اور ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں میں اپنے والد بزرگوار کو کسی حالت میں ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن کیا کروں دل سے مجبور ہوں میری طبیعت سوائے افسانہ نگاری کے کسی بات کو نہیں چاہتی ہے۔ ہمارے اباجان ڈپٹی کمشنر ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ جس طرح وہ ایک بڑے عہدہ دار ہیں۔

اور اپنے ابّا جان کا نام روشن کیا ہے اسی طرح میں بھی ایک بڑے عہدہ پر پہنچ کر
اپنے ابّا کا نام روشن کروں۔ لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اس لئے وہ مجھ سے خفا
ہیں اور اس قدر خفا ہیں کہ میری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ میں والد محترم
کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اُن کی تمام آرزوئیں مجھ سے وابستہ ہیں وہ مجھے اس راستہ پر
دیکھ کر بہت ناراض ہیں۔ اس کے برخلاف ہماری والدہ محترمہ اور بہن بہت چاہتی
ہیں۔ وہ مجھے اس حالت میں بھی دیکھ کر خوش ہیں۔ خوش کیوں نہ ہوں میں ہی
اکیلا اُن کی امیدوں کا مرکز ہوں۔ میں تنہا رہتا ہوں مجھے شادی سے نفرت ہے
والدہ محترمہ چاہتی ہیں کہ شادی کر لوں لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں اماں
جان کا ہر ایک حکم بجا لاتا ہوں لیکن یہ حکم نہ بجا سکوں گا۔ میں آزادی سے
زندگی بسر کرتا ہوں۔ ایک نوکر رکھ لیا ہے وہ کھانا وغیرہ پکاتا ہے آج میری
طبیعت معمول کے خلاف خراب ہے میں نے جلدی جلدی دفتر کا کام کیا۔ ادھورے
افسانے پورے کئے۔ اور اپنا رسالہ "بہار" اشاعت کے لئے بھجوا دیا۔ اور گھر کی
طرف چل دیا۔ راستہ میں خیال آیا کہ میری بہن جمیں کا خط آیا ہے اُس نے ساری
کی فرمائش کی ہے۔ جمیں مجھ سے بہت محبت کرتی ہے وہ بھی میری صرف ایک
ہی بہن ہیں۔ میں بھی اُسے چاہتا ہوں اُسے آرائشی سامان منگانے کا بہت
شوق ہے۔ وہ میٹرک میں ہے۔ ابا سے ساری منگوانے کو کہا ہو گا انھوں نے انکار
کر دیا ہو گا۔ اس لئے مجھے لکھا ہے۔ اگر میں ساری بھجوا دوں گا تو بہت خوش ہو گی۔
بہنوں کو تو بھائیوں کی جب خوشی ہے جب وہ اُن کے لئے تحفہ بھیجیں یہی سب
سوچ کر میں ایک دوکان کی طرف چل دیا۔ آج میری جیب میں پچاس روپے ہیں
میری آمدنی تو بہت قلیل ہے لیکن خرچ بہت ہے۔ ہر ماہ بیس روپے کے قریب
والدہ کو بھجواتا ہوں کیونکہ وہ مجھ سے بہت آس لگائے رہتی ہیں۔ اور

میں ان کی امیدوں پر پانی پھیرنا نہیں چاہتا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی سڑک پر اکا دکا آدمی نظر آرہے تھے۔ میں اپنے ہیٹ کو ذرا ترچھا کئے ہوئے جھکائے چلا جا رہا تھا کہ میری ٹکر ایک سائیکل سے ہو گئی۔ سائیکل والی ایک محترمہ تھیں یہ بہت شوخ و طرار تھیں۔ انھوں نے سبز رنگ کی ساری پہن رکھی تھی۔ وہ میرے غصہ کو دیکھ کر بولیں۔ "شراب پی کر یوں سڑکوں پر کیوں پھرتے ہو میخانوں میں پڑے رہا کرو۔" وہ حکم صادر فرما کر کپڑے جھاڑنے لگیں۔ میں بہت لاپرواہ ہوں۔ لاابالی پن سے بولا۔ "مس صاحبہ آپ کا فرمانا بجا ہے کل سے ایسا ہی کروں گا" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور سائیکل پر بیٹھ کر فراٹے بھرتی ہوئی نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ کالج کی لڑکیاں بھی کتنی چھچھوری ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں کو تو گنتی ہی نہیں۔ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتی ہیں ہم نوجوان ان کی نظروں میں کچھ نہیں۔"

یہ سب سوچتا ہوا میں ایک دوکان کے پاس پہنچ گیا۔ دوکان کے باہر میرا دوست غازی کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اور یوں مخاطب ہوا۔ "اختر صاحب! اختر صاحب! تشریف لائیے۔"

"ساری خرید نے آیا ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ شرارت سے بولا "بیوی کے واسطے۔"

میں نے اسی انداز سے کہا "جی نہیں اپنے لئے۔" وہ یہ سنکر خوب ہنسا پھر بولا "کب سے ساری پہنتے ہو۔"

میں بھی ایک حاضر جواب تھا۔ فوراً بول اٹھا۔ "جب سے تمھاری شادی ہوئی ہے۔" وہ یہ سنکر خاموش ہو گیا۔ کیونکہ اس کی شادی ہوئی نہیں تھی اور وہ بھی میری طرح شادی سے چڑتا تھا وہ اس سال ایم اے میں تھا میں اس کی طرف اٹھتی

ہوئی نظر ڈال کر اندر داخل ہوا۔ یہاں پر بہت سی لڑکیاں ساڑی پسند کر رہی تھیں لاہور کی لڑکیوں کو تو عمدہ لباس سے عشق ہے۔ ہر وقت بناؤ سنگھار کی فکر میں رہتی ہیں۔ میں ایک لڑکی کے بازو کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی محترمہ تھیں جن کی سائیکل کی ٹکر مجھ سے ہو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور شرارت سے بولی "ساڑی خریدنے آئے ہو؟" میں نے لاپرواہی سے کہا "ہاں"

وہ بولی "کس کے لئے؟"

میں نے اسی انداز سے کہا "اپنے لئے" یہ سن کر تمام لڑکیاں ہنس پڑیں۔

وہ ہنستے ہوئے بولی "کب سے ساڑی پہننا شروع کیا ہے؟"

میں نے فوراً کہا "آپ کو خبر نہیں جب سے جنگ شروع ہوئی ہے سوٹ کے کپڑے بہت گراں ملتے ہیں اور اس کی بنسبت ساڑیاں سستی ہیں جب سے ہی میں ساڑیاں پہنتا ہوں۔" میری اس ظرافت پر تمام لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ خود وہ کالی عینک والی بھی مسکرا رہی تھی۔ وہ پھر بولی "لیکن آپ نے تو سوٹ پہن رکھا ہے۔"

میں اپنے سوٹ کی طرف دیکھ کر بولا "معاف کرنا غلطی ہو گئی میں نے اسے ساڑی سمجھ کر پہن لیا ہوگا۔" میرے اس چٹکلے پر وہ پھر ہنس پڑیں۔ میں نے ایک نیلی ساڑی پسند کی اور قیمت چکا کر گھر چلا آیا۔ نوکر میرا انتظار کر رہا تھا مجھے دیکھ کر بولا "صاحب جلدی آیا کرو۔ کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔"

میں نے جوتے کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں اب میں ٹھنڈا کھانا کھا لیا کروں گا۔"

وہ ساڑی کی طرف دیکھ کر بولا "بڑی اچھی ساڑی ہے کس کیلئے لائے ہو؟"

میں نے جل کر کہا "تیری بیوی کے لئے۔"

وہ یہ سنکر شرمندہ ہوگیا اور بولا "صاحب ہم سے تو دل لگی نہ کیا کرو"
"نہیں جی تم سے کون دل لگی کرے گا تم تو لاہور کے ڈی سی ہو" میں نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ میں کھانا کھا رہا تھا وہ پنکھا جھل رہا تھا۔

وہ کچھ سوچ کر بولا "صاحب آج پہلی تاریخ ہے۔ بنیا کہتا ہے کہ پہلے پیسے لاکر دو تب جنس لے جاؤ۔ صبح گوالا کہہ رہا تھا کہ بابا سے کہہ کر دودھ کی قیمت دلوادو۔ اور ......" میں اس لمبے لیکچر سے گھبرا گیا "لا۔ سن لیا جناب میرے کان تو نہ کھاؤ۔ معلوم ہے آج سب کی قیمت چکانی ہے"

وہ لجاجت سے بولا "اور صاحب میری تنخواہ دے دو۔ ماں کو روپیہ بھجوانا ہے"

میں نے چڑ کر کہا "دے دوں گا۔ آپ کو تو ماں کے یہاں روپیہ بھجوانا ہو۔ ہمیں تو شاید بھجوانا ہی نہیں ہے۔ ادھر روپیہ آتا ہے ادھر سیڑھیاں اتر جاتا ہے۔ دیکھنا تو نصیب ہی نہیں ہوتا" میں کھانا کھا کر اٹھ گیا۔ اور جیب میں سے پندرہ روپے کے نوٹ نکال کر بولا "کریم یہ لو۔ ادھر جس کا ادھار ہے اُسے چکا دو۔ پھر اور دوں گا"

اس کے بعد میں اپنے کمرہ میں آیا۔ اور اپنی ناول "زار" پوری کرنے لگا۔ اسی وقت کریم نے آکر کہا "حضور! نور میاں آپ سے ملنے آئے ہیں"
میں نے قلم پٹخ کر ہی کہا "چین تو نصیب ہی میں نہیں ہے۔ ذرا لکھنے بیٹھو کوئی نہ کوئی آدھمکتا ہے۔ اس ناول کو تو ایک ماہ سے پورا کر رہا ہوں"
میری بات سنکر نور میاں باہر ہی سے چلائے "اختر صاحب خفا نہ ہوں بندہ جاتا ہے۔ آپ کے کام میں مخل ہونا نہیں چاہتا"

میں باہر نکل کر بولا "ارے صاحب سنئے تو" اتنے میں وہ رفو چکر ہو چکے تھے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ جتنے بھی میرے دوست ہیں سب کے سب نک چڑھے۔ اب یہ میاں کل آئیں گے تو شکایتوں کے دفتر ہی کھول دیں گے۔ ان دوستوں سے تو میں گھبرا گیا ہوں۔ میں جھینپتا ہوا اندر آیا۔ لیمپ روشن کیا اور ناول کو دور پھینکا۔ ریڈیو بجا کر دل بہلانے لگا۔ اسی وقت خیال آیا کہ ایک ناول لکھوں۔ اسی لڑکی کے بارے میں جس کی سائیکل کی ٹکر آج مجھ سے ہو گئی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ ناول ضرور لکھوں گا۔ اور ناول کا نام "دلربا" رکھوں گا۔ ناول کے لکھنے کے واسطے اس لڑکی کے حالات معلوم کرنے ضروری ہیں۔ میں نے سوچا وہ ضرور کالج میں پڑھتی ہو گی۔ کل کالج کے چوراستے پر جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ جب وہ گزرے گی تمام حالات معلوم کر لوں گا۔ میں اپنے خیال میں مگن تھا۔ ریڈیو پر گانا آرہا تھا۔ کوئی صاحب گا رہے تھے: "موہے بلاؤ گوری" میں نے لاحول پڑھ کر ریڈیو بند کر دیا۔ یہ گویے بھی کیا ہیں۔ سوائے گوری اور کالی کے گانا ہی نہیں گاتے یہ نہیں کہ کوئی قومی و وطنی گانا گائیں۔ اسی وقت میری نظر میز پر جا پڑی۔ میز پر تہمینہ کا خط رکھا تھا اس کا خط دیکھ کر فوراً ساری کی یاد آ گئی۔ میں نے ساری کو پیک کیا اور کریم کو دے کر کہا: "اسے پارسل کرا آؤ"۔

وہ حیرت سے بولا "لیکن حضور اس وقت"۔

"ہاں" پھر میں کچھ سوچ کر بولا "خیر کل صبح پارسل کر دینا۔ اگر ایک منٹ بھی دیر کی تو نوکری سے برخاست"۔ میں حکم دے کر چلا آیا۔ تھوڑی دیر ریڈیو سے دل بہلانے کے بعد نہ معلوم کب سو گیا۔ دوسرے دن دفتر گیا۔ کام بہت تھا اور اپنے رسالہ "بہار" کا سالگرہ نمبر بھی نکالنا تھا اسی کا

اہتمام کرتا رہا۔ آج بہت مصروفیت تھی۔ اس لئے کالج کے راستے پر بھی نہ جا سکا۔ سات بجے چھٹکارا ملا۔ سیدھا گھر آیا۔ آج میں بہت تھک گیا تھا اس لئے کپڑے اتارنے کے بعد کھانا بھی نہیں کھایا بلکہ بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ اسی وقت میرے کانوں میں نور میاں کی آواز آئی: "اختر صاحب اتنی جلدی کب سے سونے لگے؟"

میں نے جل کر کہا: "آ گئے خدا کے نور، نہیں نہیں جگنو میاں کے نور۔"

وہ ہنس کر بولا: "ہاں جگنو میاں کا نور ہوں۔ اب تو خوش ہو گئے اختر صاحب۔"

میں ابھی جواب ہی دینے والا تھا کہ وہ بکواسی پھر بول اٹھا: "کہو کیسی گزر رہی ہے۔ کل کون سا ایسا اہم کام تھا جو مجھے گالیاں دے رہے تھے؟"

"ارے واہ! میں نے کب گالیاں دیں، اتنا سفید جھوٹ تو نہ بولا کرو۔" میں نے تنک کر کہا۔ وہ ظریف ہنس کر بولا۔ "اچھا کالی جھوٹ بولا کروں گا۔ یہ تو بتاؤ تمھارا ناول "زار" ختم ہو گیا؟"

میں نے انگڑائی لے کر کہا: "نہیں جی وہ تو ادھورا ہے۔ پھر لکھوں گا اب میں دوسرا ناول: دل رُبا، لکھوں گا۔"

وہ میرے بازو سہلاتے ہوا بولا: "واہ رے خبطی ابھی ایک ناول تو پورا نہیں ہوا۔ دوسرا بھی شروع ہو گیا؟ کس کے بارے میں لکھو گے اس بجائے "زار" ناول کو تو مجھ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اب کے کس کو پھانسنا ہے؟"

میں نے ہنس کر کہا: "پھانسنا وانسا نہیں ہے۔ البتہ ایک لڑکی کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔"

وہ آنکھیں نچا کر بولا: "یہ مرض کب سے شروع ہوا؟"

میں نے سمجھاتے ہوئے کہا: "یہ مرض ورض نہیں۔ بلکہ تاثرات ہیں۔"

"اچھا آپ ایک لڑکی سے بھی متاثر ہوئے ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے "تائی سے کھسیلتے ہوئے کہا: ہاں اُس کی شوخیوں سے متاثر ہوا ہوں"

"تم کو اُس کے حالات معلوم ہیں" اُس نے سوال کیا۔

"معلوم کروں گا" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ مسکرا کر بولا "ہاں تمھیں معلوم کرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ خدا نے جو اتنی اچھی شکل عطا کی ہے"

میں نے اس کی کالی رنگت پر پھبتی کستے ہوئے کہا۔ خدا نے بہت اچھا کیا جو تمھیں کالی رنگت عطا فرمائی۔ ورنہ نہ جانے کیا کرتے"۔

وہ آنکھیں نکال کر بولا "کرتا کیا تمھاری چوری کرتا۔

"ہاں" میں مسکرا کر بولا۔

وہ غصہ سے بولا۔ بڑے امیر ہیں جو تمھاری دولت چرالیتا۔ کمشنر صاحب کے لڑکے اور ایڈیٹر واہ" میں نے جل کر کہا "اور تم کون توپ چند ہو ایم لے میں دو سال سے فیل ہو رہے ہو"

غرض اسی طرح تھوڑی دیر تک نوک جھونک ہوتی رہی۔ وہ میرے ساتھ کھانا کھا کر چل دیا۔ نور میرا راز دار اور بے تکلف دوست ہے۔ وہ کالا ہونے کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اور ہر وقت میری خوبصورتی پر رشک کرتا رہتا تھا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے لیکن میں کالج کے راستہ پر نہ جا سکا۔ کیونکہ فرصت نہ ملتی تھی۔ انھیں دنوں میرا ناول "نزار" چھپ چکا تھا۔ یہ حلقۂ ادب میں بہت مقبول ہوا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ گرمی کافی

تھی۔ مجھے ذرا فرصت بھی کیونکہ سالگرہ نمبر شائع ہو چکا تھا۔ اور دوسرا رسالہ بھی پریس میں جا چکا تھا میں نے آج کالج جانے کا مصمم ارادہ کر لیا میں ایک چورستہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے کالج کی سب لڑکیاں جاتی تھیں تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی نظر آئی جس کی سائیکل کی ٹکر مجھ سے ہو گئی تھی۔ اس نے آج شلوار پہن رکھی تھی۔ دو چوٹیاں آگے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی میں نے اپنی ناول "زار" اس کے ہاتھ میں دیکھ کر کہا "یہ ناول آپ کو پسند ہے"۔

وہ ہنس کر بولی "بہت پسند ہے میری تمام کلاس فیلو لڑکیوں نے یہ کتاب خریدی ہے۔ بہت مزاحیہ ناول ہے اختر صاحب کا شاہکار ہے۔ آپ بھی ضرور خریدیئے۔ حسن بھائی ٹاٹا والا کے یہاں سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے"۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اختر صاحب کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں"۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "وہ بہت اعلیٰ دماغ اور اچھے معلوم ہوتے ہیں"۔

"تم نے اُسے دیکھا ہے"۔ میں نے سوال کیا۔

"نہیں"۔ وہ کتابیں ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھنے کی تمنا ہے"۔ میں نے پھر سوال کیا۔

"ہاں"۔ وہ جانے لگی۔ میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"تو میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔ اس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔ وہ آنکھیں مٹکا کر بولی "آپ ناول لکھ سکتے ہیں"۔

"کیا ہوا" میں نے اس کے ہاتھ کے ناول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ جب لکھ لیا ہے تو دوسرا ناول لکھنے کو کیا ہوا"۔

وہ بولی: "لیکن یہ تو اختر صاحب کا ناول ہے"۔

"خاکسار ہی تو اختر ہے"۔ میں نے انکساری سے کہا۔

وہ بولی "مجھے تو یقین نہیں آتا۔ اب میں جاتی ہوں۔ میں ناول میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی"۔

آپ مدد ضرور کر سکتی ہیں۔ کل میرے گھر آئیے میں منت کرتا ہوں"۔ میں نے اپنے پتے کا کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ کارڈ لے کر بولی "کوشش کروں گی"۔ وہ چلی گئی۔ دوسرے دن میں دفتر سے واپس آیا ناول کا خیال دل سے اتر چکا تھا۔ میں کھانا کھا کر اپنا سالگرہ نمبر پڑھنے لگا اس میں مس جمال آگرہ کا افسانہ "مجھ سے کہو" بہت عمدہ تھا۔ یہ جنابہ کئی مرتبہ ہمارے رسالہ میں مضمون بھیج چکی ہیں۔ یہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں سے مجھے "سادگی" افسانہ بہت پسند تھا۔ یہ افسانہ بہت اونچے پیرایہ کا تھا میں ان جنابہ کے افسانے کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا۔ کہ کریم نے آکر کہا: "آپ سے کوئی ملنے آیا ہے"۔

میں نے رسالہ رکھتے ہوئے کہا: "وہی نور میاں ہوں گے خدا ان کے نور سے بچائے"۔

وہ بولا حضور کوئی لڑکی ہے" میں اچھل پڑا" لڑکی" اور دروازہ کے پردے ہٹاتے ہوئے کہا: "آئیے تشریف لائیے"۔ وہ گھر میں آئیں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں وہ ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرہ سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ بولی مجھے معلوم نہ تھا آپ

میرا مذاق اڑائیں گے۔"

میں نے گھبرا کر کہا "لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی"

آخر ان پُر تکلف چیزوں کی کیا ضرورت۔ میں کوئی بزرگ ہستی نہیں ہوں"۔

آپ بزرگ ہستی نہیں۔ اہم ہستی ضرور ہیں۔ میں آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہوں" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

وہ مستعدی سے بولی "ضرور پوچھیے"

"آپ کا اسم گرامی ؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"خاکسار کو کاشف فیروز الدین کہتے ہیں"

میں نے ہنس کر کہا "وہی فیروز الدین ڈاکٹر۔ وہ بہت بھلے آدمی ہیں "بہار" کو بہت پسند کرتے ہیں"

وہ خاموش رہی۔ پھر میں نے کہا "آپ کیا پڑھتی ہیں"

"بی اے میں ہوں"

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے"

اُس نے بے دھیانی سے کہا "ڈاکٹر بنوں گی"

میں نے کہا "بہت اچھا خیال ہے۔ ہاں آپ سائیکل تو چلا لیتی ہوں گی موسیقی سے بھی دلچسپی ہوگی۔ ڈانس بھی کر لیتی ہوں گی" میری بات سن کر وہ جل گئی۔ اور مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے پھر کہا "اب یہ آخری سوال ہے صحیح جواب دیجیے گا۔ کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے"

وہ بگڑ کر بولی۔ آخر یہ سب پوچھنے کا مطلب۔ آپ نے مجھے ایکٹریس سمجھ رکھا ہے" اُس کا چہرہ غصّے سے لال تھا۔

میں نے کہا "جناب غصہ نہ ہوئیے۔ میں نے آپ کو ایکٹریس نہیں سمجھ رکھا ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں ناول لکھ رہا ہوں۔ اس میں آپ کے حالات معلوم کرنے ضروری ہیں۔ شرمائیے نہیں ٹھیک ٹھیک بتا دیجئے۔"

وہ ذرا ٹھنڈی ہو کر "خیر میں آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔ سائیکل تو چلا سکتی ہوں۔ موسیقی سے دلچسپی ہے۔ ڈانس سے نفرت ہے۔ محبت وغیرہ تو جانتی نہیں۔ شادی سے چڑ ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "یہ دنیا تو لڑکیوں میں کھیل چکی ہے۔"

وہ بولی "آپ ناول تو لکھ لیں لیکن مقبول نہ ہو گا۔"

واہ اختر صاحب کا ناول مقبول نہ ہو" میں نے اکڑ کر کہا۔

وہ یقین نہ کرتے ہوئے بولی "لیکن آپ اختر صاحب نہیں ہیں۔"

میں خاموش ہو رہا۔ بھلا اب میں اُسے کیسے یقین دلاتا وہ چلی گئی میں ناول لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ایک ماہ میں میرا ناول "دلربا" تیار ہو گیا اس دوران میں میری ملاقات گلشن سے نہیں ہوئی میں کئی دفعہ ڈاکٹر فیروالدین کے یہاں گیا۔ لیکن وہ نظر نہ آئی۔ میرا ناول اردو ادب میں بہت مقبول ہوا میں اپنے دفتر کے کمرہ میں بیٹھا "دلربا" ناول کی ورق گردانی کر رہا تھا آج میری طبیعت خراب تھی۔ سر میں درد تھا۔ اسی وقت گلشن داخل ہوئی بہت دنوں کے بعد وہ مجھے نظر آئی تھی۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا "آؤ بیٹھو" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "معاف کرنا اختر صاحب میں نے آپ کو اور کچھ سمجھ لیا تھا۔"

میں نے ضد کرتے ہوئے کہا "لیکن میں اختر صاحب نہیں ہوں"

وہ شرمندہ ہوکر بولی۔ جند چھوڑ دیجئے۔ یہ تو میری بھول تھی۔" وہ میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھی اور "دلربا" کی ایک جلد لے کر چلی گئی۔ دوسرے دن میں فیروزالدین کے یہاں گیا۔ اُن سے معلوم ہوا گلشن ڈاکٹری پڑھنے بمبئی گئی ہے۔ اُس سے مجھے گلشن کے حالات نہیں معلوم ہوئے۔ اکتوبر کے رسالہ میں مس جمال آگرہ نے ایک نظم چھپوائی جس کا عنوان "گلشن کو ڈاکٹری مبارک ہو" تھا اب مجھے معلوم ہوا کہ گلشن اور جمال میں کچھ رشتہ ہے۔ کچھ دن تک جمال کے افسانے آتے رہے پھر اُس نے بھی افسانہ بھیجنا بند کر دیا۔ چند دنوں میں گلشن کو میں بالکل بھول گیا۔ دو چار سال تک میں ایڈیٹری کرتا رہا۔ ابا مجھ سے بہت ناراض تھے۔ اماں اور چمن کے کہنے سے میں نے ایڈیٹری چھوڑی۔ ابا کی رائے سے میں تجارت کرنے لگا لیکن میرا دل تجارت میں نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت افسانہ لکھتا اور پڑھتا تھا۔ ابا نے میری لائبریری میں جس میں میری تصانیف تھیں قفل ڈلوا دیا۔ میرا دل ہر وقت اپنی تصانیف پڑھنے کے لئے بے چین رہتا۔ ایک دن میری طبیعت بہت اداس تھی اُسی دن چمن اپنی سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ چمن کی شادی دو سال ہوئے بیرسٹر نوری سے ہوگئی تھی۔ چمن مجھے اداس دیکھ کر بولی "بھیا آج بہت اداس معلوم ہوتے ہو۔"

"کیا کروں چمن میرا تو تجارت میں دل نہیں لگتا۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "تم شادی کر لو۔ دل خوب لگے گا۔"

"جس طرح تیرا دل لگتا ہے۔ اسی طرح سب کو سمجھے ہوئے ہے۔ شادی سے بہتر ہے میرا گلا گھونٹ دو۔" میں نے چڑ کر کہا۔

وہ تنک کر بولی۔ "آپ تو چڑ جاتے ہیں پھر آپ کا دل کیسے بہلے گا۔"

میں نے کہا: "بہلے گا کیوں نہیں۔ مجھے لائبریری مل جائے افسانہ نویسی اور ایڈیٹری پھر واپس دیدی جائے۔ میں خوش ہوں۔ تو ہی بتا ان کا پنچھی بھلا پنجرے میں کیسے خوش رہ سکتا ہے"

وہ آنکھیں مٹکا کر بولی: "تو آپ آزاد رہنا چاہتے ہیں"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "میری اچھی بہن ایک کام کر تو جا کر دادا کے پاس سے میری لائبریری کی کنجی اٹھا لا۔ مجھے اپنی تصانیف پڑھنے کو دل چاہتا ہے"

وہ ایک فرماں بردار بہن کی طرح اٹھی اور تھوڑی دیر میں نہ جانے کس طرح سے دادا کے پاس سے کنجی چرا لائی۔ میں لائبریری میں آ گیا لائبریری کی بہت بری حالت تھی۔ الماریوں پر گرد جم گئی تھی۔ کئی کتابوں کو دیمک لگ گئی تھی۔ میں کتابیں درست کرنے لگا۔ چمن میرا ہاتھ بٹانے لگی وہ ایک جلد جس کی بہت خراب حالت تھی دیتے ہوئے بولی "بھیا یہ کتاب کتنی بوسیدہ ہو گئی ہے"

میں نے کتاب کو دیکھا۔ "دلربا" ناول تھا۔ مجھے یہ ناول دیکھ کر ماضی کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے چمن سے کہا: "یہ ناول مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ میرا شاہکار ہے۔ یہ میرا آخری ناول ہے۔ اس کے بعد میں نے کوئی ناول نہ لکھا اس سے ایک کہانی وابستہ ہے" پھر میں نے تمام واقعات سنائے چمن خاموش سی تمام واقعات سنتی رہی۔ بعد میں رائے قائم کرتے ہوئی بولی: "بھیا اگر تمہاری شادی اس سے ہو جاتی تو تم خوش ہوتے۔" میں نے چڑ کر کہا: "ہرگز نہیں وہ میرے ناول کی خام مواد تھی اس کے سوا کچھ نہیں تم کسی کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے رائے نہ قائم کر دیا کرو" میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی: "بھیا مجھ سے چھپاتے

کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہاری آنکھوں سے تمہارے دل کا حال پڑھ لونگی"۔

"بڑی شریر ہے" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولی "بھیا سچ سچ کہہ دو نا میں تو تمہاری رازدار ہوں"

میں نے عاجزی سے کہا "سچ کہتا ہوں چمن میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں"

اسی وقت کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ابا کھڑے تھے۔ وہ ڈانٹ کر بولے "کیوں ری چمن اسی لئے کنجی لائی تھی اور میاں اختر تم تو تجارت میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہر وقت تمہارا دل کتابوں میں لگا رہتا ہے" وہ میرے ہاتھ سے "دل رُبا" ناول لے کر چلنے لگے انہوں نے لائبریری میں قفل چڑھا دیا۔ میں نے آخری نظر لائبریری پر ڈالی اور اُن کے ساتھ چل دیا۔ ابا کمرہ میں آکر بولے

اختر تم کو آج کلکتہ جانا ہوگا۔ میرا جی کہتے ہیں وہاں کی فرم سے نمونہ لے آؤ"

میں ایک فرماں بردار لڑکے کی طرح خاموش رہا۔ میرا دل کلکتہ جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ابا کا نادر شاہی حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ تین بجے ریل سے میں کلکتہ روانہ ہوگیا۔ سردی کا موسم تھا خشک ہوائیں آ رہی تھیں میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی۔ میں نے کلکتہ میں ڈاک بنگلہ میں قیام کیا۔ دوسرے دن میں دوا کے واسطے اسپتال گیا۔ بنچ پر بیٹھا تھا کہ کسی نے کہا۔ "ڈاکٹر تسلیم اسوقت اپریشن کر رہے ہیں ان کو فرصت نہیں" میں نے مڑ کر دیکھا گلشن ڈاکٹری لباس میں کھڑی تھی۔ اس نے شاید پہچانا نہیں تھا۔ میں چلا آیا دوسرے دن میں گلشن کے گھر گیا وہ صوفے پر لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی

یہ میری تصنیف تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔" میں نے کہا آپ نے مجھے پہچانا نہیں"
وہ بولی:" میں آپ کو نہیں پہچانتی ہوں"
" میں اختر مصنف ہوں" میں نے کہا۔ وہ یہ سن کر کھل گئی اور مسکرا کر کہا:" مجھے تو خواب میں بھی خیال نہیں ہوا تھا۔ آپ کتنے بدل گئے ہیں۔ ہاں آپ نے ناول لکھنا کیوں چھوڑ دیا کئی سالوں سے آپکا کوئی ناول شائع نہیں ہوا"
میں نے تمام واقعات سنائے۔ اور اپنی مجبوری ظاہر کی وہ بولی:" والدین بھی بہت ضدی ہوتے ہیں۔ آپ نے اُن کو خوش کرنے کے لئے اپنے شوق کو قربان کر دیا۔ اسی طرح میں نے بھی اپنے ابا کو راضی کرنے کے لئے اپنے جذبات کی قربانی کی ہے"
میں نے کہا:" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"
وہ کتاب رکھتے ہوئے بولی:" آپ مجھے مس فیروزالدین سمجھتے ہوں گے لیکن میں مسز جمیل ہوں"
لیکن آپ تو شادی نہیں کر رہی تھیں" میں نے تعجب سے کہا۔
وہ بولی:" ہاں میرا مصمم ارادہ تھا۔ لیکن میرے والد کے سامنے میری کچھ بن نہ پڑی۔ جب میں ڈاکٹری سیکھنے بمبئی گئی۔ تو ابا نے میری شادی میرے چچازاد بھائی جمیل سے طے کر لی جمیل بہت خشک مزاج ہیں۔ وہ لڑکیوں کی ترقی نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں نوکری کرنی پسند نہیں ہے۔ بی۔ اے تک پڑھے ہیں لیکن کوئی ملازمت نہیں کرتے۔ جب تک شادی نہیں ہوئی تھی وہ ہمارے ابا کی کمائی کھاتے رہے۔ اب میری کمائی کھا رہے ہیں۔ میں نے ابا سے انکار کیا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر اُن کو راضی کرنے کے لئے میں نے شادی کر لی۔ دو سال ہماری شادی کو ہو گئے"

میں نے کہا مسز جمیل کہاں ہیں؟"
وہ حقارت سے بولی: "وہ کسی لکچر میں گئے ہیں اب آتے ہی ہوں گے ادھر ادھر فالتو گھومنا بہت پسند آتا ہے۔ جب میں انکو ملازمت کرنے کو کہتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ میری خودداری گوارا نہیں کرتی۔ اگر تجارت کرنے کو کہتی ہوں تو وہ انکار کر دیتے ہیں"
وہ خاموش ہو گئی۔ اسی وقت ایک صاحب داخل ہوئے انھوں نے شیروانی اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے کافی خوبصورت تھے۔ چہرے سے شریف اور خاموش طبیعت معلوم ہوتے تھے وہ میری طرف ایک غلط نگاہ ڈال کر بیٹھ گئے گلشن نے تعارف کراتے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے کہا "یہ میرے دوست ہیں۔ اور یہ میرے سرتاج مسٹر جمیل ہیں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں کیونکہ مجھے ہسپتال جانا ہے" وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔
میں نے جمیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بہت خوش مزاج ہیں گلشن"
وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے "بہت خوش مزاج ہیں ارے جناب وہ تو مجھ سے بات تک نہیں کرتیں۔ وہ صرف اپنے دوستوں سے خوش اخلاقی سے پیش آتی ہیں اور یہ میری خوش اخلاقی ہے کہ ان کے دوستوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں وہ اپنے دوستوں سے خوش ہیں اور مجھ سے نفرت کرتی ہیں"
"آپ کیا کہہ رہے ہیں" میں نے تعجب سے کہا۔
وہ بولے "آپ یقین کیجئے میں سچ کہہ رہا ہوں تم بھولی بھالی گلشن کے بارے میں کچھ سننا چاہتے ہو۔ انھوں نے ابھی مجھے طعنہ سے سرتاج کہا

ہے۔ ورنہ وہ مجھے جوتی کی برابر نہیں سمجھتیں وہ مجھ کو حقیر سمجھتی ہیں لیکن میری شرافت ہے کہ ان کی نفرت کرنے کے باوجود میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے ملازمت کرنے کو کہتی ہیں لیکن میری خودداری اجازت نہیں دیتی میں خود ان سے شادی کرنے کو راضی نہ تھا لیکن چچا جان کی مرضی سے شادی کی ہے۔ شادی کے پہلے بھی وہ مجھ سے نفرت کرتی تھیں میرے دل میں ان کے لئے محبت نہیں بلکہ ہمدردی ہے۔ میرے والدین بچپن سے مر گئے تھے۔ چچا فیروز الدین نے میری پرورش کی وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی محبت کے باوجود میں اداس رہتا تھا وہ مجھے خوش رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے میرے بارے میں غلط رائے قائم کی۔ وہ سمجھے کہ میں گلشن کے بارے میں اداس ہوں لیکن اصل بات ان کو معلوم نہ تھی کہ میری فطرت ہی ایسی ہے۔ انھوں نے میری شادی گلشن سے کرنی چاہی میں انکار نہ کر سکا گلشن ہر وقت مجھ کو طعنہ دیا کرتی ہے۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے میں جانتا ہوں وہ اختر ہے۔ پہلے وہ مصنف تھا اور اب نہ جانے کہاں ہے کئی سال سے اس نے کوئی ناول نہیں لکھا جس کا رنج گلشن کو بہت ہے وہ کہتی ہے کہ اختر اگر کتابیں لکھتا رہے۔ تو وہ مشہور مصنف ہو سکتا ہے وہ چاہتی ہے اس کا نام اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہے۔ اُس کا خیال ہے کہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔"

اختر نے گلشن کے بارے میں ایک ناول "دلربا" لکھا تھا۔ جو گلشن کی لائبریری میں موجود ہے اس کے پاس اختر کا ایک فوٹو بھی ہے۔ اس کی لائبریری میں تمام کتابیں اختر کی لکھی ہوئی ہیں۔"

میں اپنے بارے میں سُن کر بہت گھبرایا میں بولا جمیل صاحب مجھے

آپ اختر کا فوٹو دکھائیں گے۔" انھوں نے ہاں کر دی اور ہم دونوں لائبریری میں گئے۔ لائبریری میں تمام کتابیں میری لکھی ہوئی اور "دلربا" ناول پر سنہری جلد چڑھی ہوئی تھی۔ ایک بڑی تصویر میز پر رکھی تھی جس کے نیچے اختر لکھا ہوا تھا مجھ کو یاد تھا یہ تصویر میں نے جمال آگرہ کی فرمایش پر اس کو بھجوا دی تھی۔ میں نے کہا یہ تصویر گلشن کو اختر نے دی ہے۔"

جمیل بولے۔ "نہیں ان کی کسی سہیلی نے ان کو بطور تحفہ دی تھی۔"

میں خاموش ہو گیا تھوڑی دیر بعد میں گھر چلا آیا۔ میں ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈاک بنگلہ نہر کے کنارے تھا۔ دوسرے دن شام کے وقت میں نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ گلشن کی محبت بھی عجیب ہے، اس نے اپنی محبت کا مجھ سے کبھی اظہار بھی نہیں کیا۔ اس کی باتوں سے بھی تو نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ جمیل کا وہم ہے۔ پھر میں نے خیال کیا کہ یہ سچ ہے وہ مجھ سے ضرور محبت کرتی ہے۔ کبھی تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے۔ اور میری کتابوں سے کتنی دلچسپی لیتی ہے۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا گلشن کھڑی تھی۔ وہ شام کے لباس میں بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے سے تھوڑی اداسی ظاہر ہو رہی تھی وہ میرے کچھ فاصلہ سے بیٹھ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "اختر صاحب آپ پھر کتابیں لکھنا شروع کر دیجئے میرا خیال ہے کہ آپ ضرور کامیاب مصنف ہوں گے میری تو یہی تمنا ہے کہ آپ کی شہرت ہو اور آپ کا نام دنیا میں ہمیشہ کیلئے قائم ہو جائیگا

یہ الفاظ سن کر میں چونک پڑا کیونکہ یہ سب میں جمیل سے سن چکا تھا۔

میں نے کہا "گلشن پہلے یہ بتاؤ تم مجھے مصنف بنانا کیوں چاہتی ہو؟"

وہ سادگی سے بولی "کیوں کہ آپ میں صلاحیت ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ جیسا قابل انسان پستی کے غار میں پڑا رہے۔ میں آپ کو دنیا کا سرتاج بنانا چاہتی ہوں"

میں اس کی یہ باتیں سن کر ہنسا۔ وہ خاموش رہی۔ میں چیں بجبیں ہو کر بولا "غلط بالکل غلط تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن تم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ تم کو اپنے شوہر سے محبت کرنی چاہئے"

وہ یہ سن کر چونک پڑی۔ وہ بگڑ کر بولی "آپ کیا بک رہے ہیں مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ جب اپنے شوہر اپنے مجازی خدا سے محبت نہیں کرتی تو آپ کون ہیں۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ مجھے آپ سے نہیں بلکہ آپ کے علمی جذبے سے، آپ کی کتابوں سے محبت ہے۔ میں علم کو اپنی روح سمجھتی ہوں۔ اس لئے علم کے قدر کرنے والے کی عزت بھی میرے دل میں ہے۔ اختر صاحب آپ بتا سکتے ہیں یہ بات آپ سے کس نے کہی یا آپ کا خود کا خیال ہے"

میں نے شرمندہ ہو کر کہا "معاف کرنا گلشن یہ میرا خود کا خیال نہیں بلکہ تمہارے شوہر کی رائے ہے۔ مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا تھا"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی پھر بولی "وہ کچھ خبطی سے ہو گئے ہیں۔ ایسے الزامات اکثر مجھ پر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ مجھے ڈاکٹر سے محبت ہے کبھی فرماتے ہیں کہ میں ان کے دوست بیرسٹر محمود سے محبت کرتی ہوں۔ اب کہتے ہیں کہ مجھے اختر مصنف سے محبت ہے"

میں نے کہا "تمہارے دل میں کسی کے لئے محبت نہیں ہے"

وہ بولی "نہیں میں دنیا کے کسی فرد سے محبت نہیں کرتی میرے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگی ہے۔ اس لئے یہ جذبہ میرے دل سے ختم ہو گیا والد کریم نے تو بہت

بڑی ٹھیس لگائی ہے۔ اب میرے شوہر صاحب طرح طرح کے الزامات مجھ پر لگاتے ہیں۔ بھلا میں ایسے شوہر سے محبت کر سکتی ہوں؟"

وہ تھوڑی دیر تک غصہ سے خاموش ہی۔ پھر بولی: "اختر صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ نام پیدا کریں۔ کیا آپ ایسا کریں گے وعدہ کیجئے"۔

میں ہمت کر کے بولا: "گلشن میں تو وعدہ نہیں کرتا۔ کیونکہ میں اپنے والد کو ناراض کرنا نہیں چاہتا ہوں جس طرح تم نے اپنے جذبہ کو اپنے والد کے قدموں پر نچھاور کر دیا ہی اگر میں بھی اس شوق کو قربان کر دوں تو کوئی بڑی قربانی نہ ہوگی"

وہ خفگی سے بولی: "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہوگی اتنی بڑی قربانی کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اس میں علم کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس راستہ میں ترقی کا راز مخفی ہے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے جذبات اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ کبھی نہ کبھی فنا ہو جاتے لیکن یہ شوق مٹنے کا نہیں۔ بلکہ دن بدن ترقی کرے گا۔

میں نے دوبارہ کہا: "میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ تمہارے خیالات سے زیادہ مجھے ابا کا حکم پیارا ہے۔ میں ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کر سکتا ہوں باپ کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔ کیا میں اس فرض کو بھول جاؤں"۔ میں اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ میری زبان یارا نہ دیتی تھی۔

وہ میری طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر بولی: "سچ کہتے ہو اختر باپ کے حکم سے بڑھکر کوئی فرض نہیں۔ ہم دونوں نے ان کے لئے قربانی کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جذبات اور شوق مسافر تھے جو اسٹیشن آنے پر اتر گئے۔ اور اب ہم تنہا ہیں۔ خیر اب یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے پھر زبردست ٹھیس لگی ہے جس کا زخم مرتے دم تک رہے گا۔ اس لئے میں آپ سے نہ ملونگی

اگر میں آپ کو دیکھ لوں گی تو زخم گہرا ہو جائے گا۔ اور میں درد سے پاگل ہو جاؤں گی اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن میں انبالہ چلا آیا۔ اب مجھے اپنی لائبریری افسانہ نویسی سب سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو تجارت کے لیئے وقف کر دیا۔ تاکہ ابّا خوش ہو جائیں۔ اور ان کے دل کی مراد مل جائے اب میں کامیاب تاجر ہوں۔ ابّا خوش ہیں۔ لیکن انھیں معلوم نہیں کہ ان کے بیٹے نے اپنی روح، جذبہ، اور شوق کی قربانی کر کے اس تجارت کو ترقی دی ہے۔ میرا دل بجھ چکا تھا۔ مجھے کوئی تمنا نہیں تھی۔ میں صرف ابّا کے خیال سے خوش تھا۔ اس دن سے میری ملاقات گلشن سے نہیں ہوئی۔ اور نہ میں نے کوشش کی۔ اب میرے دل سے محبّت کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔

یہ ہے میری زندگی کی داستان۔ محبّت بھی کیا شے ہے جو آکر پھر چلی جاتی ہے۔